بہادر شاہ

اور

پھول والوں کی سیر

کتب خانہ علم و ادب دہلی

(ہمدرد پریس دہلی)

بہادر شاہ

اور

پھول والوں کی سیر

مصنفہ

جناب مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی بی اے

باجازت مصنف

کتب خانہ علم و ادب دہلی

سے شائع ہوئی

قیمت آٹھ آنے

طبع سوم

ہمدرد پریس دہلی میں طبع ہوئی
قیمت آٹھ آنے

بہادرشاہؒ
اور
پھول والوں کی سیر

سعدی علیہ الرحمہ نے خوب کہا ہے ؎

رعیت چو بیخ است و سلطاں درخت
درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

یہ جڑوں ہی کی مضبوطی تھی کہ دلی کا سرسبز و شاداب چمن اگرچہ حوادث زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا اور فلاکت کی بجلیوں اور باد مخالف کے جھونکوں سے سلطنت مغلیہ کی شوکت و اقتدار کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر دلی کو اپنی سلطنت میں شریک کرلے، مرہٹوں کا زور ہوا پٹھانوں کا زور ہوا۔ جاٹوں کا زور ہوا۔ انگریزوں کا زور ہوا، مگر دلی کا بادشاہ دلی کا بادشاہ ہی رہا، اور جب تک دلی بالکل تباہ نہ ہوئی اسوقت تک کوئی نہ کوئی تخت پر بیٹھنے والا نکلتا ہی رہا۔ دلی کے ریزیڈنٹ نے بہت کچھ چاہا کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی کردے، گورنر جنرل نے بڑی کوشش کی شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر کے قلعہ

پر قبضہ کر لے، کورٹ آف ڈائریکٹرز نے بہت زور مارا کہ دلی کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے مگر بورڈ والے اس پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، وہ جانتے تھے کہ دلی کا بادشاہ کیا ہے اور اس کے اثرات کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے میاں چٹے ہوئے نوجوانوں نے بہت کچھ جوش و خروش دکھایا مگر انگلستان کے جہاں دیدہ بڈھوں کے سامنے کچھ نہ چلی، جب بورڈ میں مسٹر ملکر نے کھڑے ہو کر کہا۔ عزیزو! میں پچاس سال ہندوستان میں رہا ہوں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں میں جانتا ہوں کہ دلی کا قلعہ کیا ہے۔ اس کی بنیاد اگر کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری جانب کاٹھیاواڑ تک۔ ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا تو وہ زلزلہ آئیگا کہ سارا ہندوستان ہل جائیگا۔ یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔ آخر بورڈ میں بڈھے جیتے اور نوجوان ہارے۔ دلی کے بادشاہ کا اقتدار ضرور کم ہو گیا مگر جو عقیدت تھی وہ جیسی کی ویسی رہی، رعایا کی وہ کونسی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں اور بادشاہ کا وہ کونسا رنج تھا جس میں رعایا شریک نہ ہوتی ہو، بات یہ تھی کہ دونوں جانتے اور سمجھتے تھے کہ جو ہم ہیں وہ یہ ہیں اور جو یہ ہیں وہ ہم ہیں۔

شاہ عالمگیر ثانی کے قتل کے واقعہ ہی پر نظر ڈالو۔ دیکھو کہ ہندو مرد تو مرد عورتوں کو بادشاہ سے کیسی محبت تھی اور خود بادشاہ اس محبت کی کیسی قدر کرتے تھے عالمگیر ثانی کو فقیروں سے بڑی عقیدت تھی جہاں سن پاتے کہ کوئی فقیر آیا ہوا ہے اس کو بلاتے، نہ آتا تو خود جاتے اس سے ملتے بہت کچھ دیتے دلاتے اور فقیر نوازی کو

توشۂ آخرت سمجھتے تھے۔ غازی الدین اس زمانہ میں دلّی کا وزیر تھا۔ خدا جانے اسکو بادشاہ سے کیوں دلی نفرت تھی۔ قلعہ میں تو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی، دھوکے سے بادشاہ کو مارنے کا جال پھیلایا۔ قلعہ میں مشہور کردیا کہ پرانے کوٹلہ میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں، بڑے صاحب کرامات ہیں، بڑے خدارسیدہ ہیں مگر نہ کہیں خود جاتے ہیں نہ کسی کو آنے دیتے ہیں، ادہر بادشاہ کو ملنے کا شوق ہوا۔ ادہر لوگوں نے شاہ صاحب کی کرامتوں کے ادر پل باندھے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رات بادشاہ تن تنہا قلعہ سے نکل کر کوٹلہ پہنچے، اِدہر اُدہر کھنڈروں میں تلاش کی یہاں تو پہلے ہی سے دشمن لگے ہوئے تھے، چار نمک حراموں نے ایک برج میں سے نکلکر بادشاہ کو شہید کردیا اور لاش جمنا کی ریتی میں پھینک دی، خدا کی قدرت دیکھو ادہر سے ایک برہمنی رام کور آرہی تھی اس نے جو لاش پڑی دیکھی ذرا ٹھٹکی بھاگنے کا ارادہ کیا پھر ذرا غور کیا تو کیا دیکھتی ہے کہ ہیں یہ تو بادشاہ سلامت کی لاش ہے، رات بھر اس بیکس شہید کا سر زانو پر لئے ہوئے بیٹھی روتی رہی صبح جمنا جی کے اشنان کو لوگ آئے انہوں نے بھی لاش کو دیکھکر پہچانا۔ تمام شہر میں کھلبلی پڑگئی! اس بیکس شہید کی لاش دفن ہوئی شاہ عالم ثانی بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے رام کور کو بلایا بہت کچھ انعام و اکرام دیا اور اس برہمنی کو اپنی منہ بولی بہن بنالیا۔ تھوڑے دنوں میں سلونوں کا تہوار آیا۔ بھائی کے لئے بہن موتیوں کی راکھی لیکر پہونچی۔ بادشاہ نے خوشی خوشی راکھی بندھوائی۔ بہن کو جوڑا دیا۔ اس کے رشتہ داروں کو خلعت دیئے۔ لیجئے راکھی بندھن کی رسم قلعہ کی رسموں میں شریک ہوگئی۔ جب تک قلعہ آباد رہا اس برہمنی کے خاندان اور قلعہ والوں میں

بھائی چارہ رہا۔ ہر سال راکھیاں آتیں۔ بادشاہ اور شہزادوں کے باندھی جاتیں۔ جوڑے دیئے جاتے۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب بادشاہ سے قلعہ چھوٹا۔

پھول والوں کی سیر بھی اسی محبت باہمی کا نتیجہ تھی، ہوا یہ کہ اکبر شاہ ثانی اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولیعہد بنانا چاہتے تھے، سراج الدین ظفر بڑے تھے مگر باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی۔ مرزا جہانگیر کو بادشاہ بہت چاہتے تھے اور کیوں نہ چاہتے مرزا کی والدہ نواب ممتاز محل کا قلعہ میں زور تھا، بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم دونوں نے ریزیڈنسی میں کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جہانگیر ولیعہد ہو جائیں، اس زمانہ میں دلی کے ریزیڈنٹ اسٹین صاحب تھے، ایسا بادشاہ پرست انگریز ہندوستان میں شاید ہی کوئی آیا ہو تو آیا ہو، اکبر شاہ کی وہ ایسی ہی عزت کرتے تھے جیسے اپنے بادشاہ کی کرتے تھے، ٹوپی اتار کر مجرا گاہ سے آداب بجالاتے کرسی دیجاتی تو بادشاہ کے سامنے کبھی نہ بیٹھتے گفتگو میں آداب شاہی ملحوظ رکھتے۔ بادشاہ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے، غرض سب کچھ کرتے مگر اس بات پر راضی نہ ہوتے تھے کہ مرزا جہانگیر ولی عہد ہوں، بظاہر اسکی ایک وجہ تھی کہ وہ سلسلہ تخت نشینی کو درہم برہم کرنا نہیں چاہتے تھے اور دوسری یہ تھی کہ وہ مرزا جہانگیر کے عادات واطوار سے مطمئن نہ تھے۔

مرزا جہانگیر بلا کے پینے والے اور غضب کے منہ پھٹ تھے، اس مخالفت سے دلوں میں بیر تو پڑ ہی گیا تھا، ایکدن سر دربار مرزا جہانگیر نے اسٹین صاحب کو "لولو ہے بے" کہدیا صاحب کسی نہ کسی طرح پی گئے، تھوڑے دن بعد یہ غضب کیا کہ ان پر گولی

چلائی۔ آخر کہاں تک طرح دیجاتی۔ قید ہو کر الہ آباد گئے۔ ممتاز محل کو بڑا صدمہ ہوا منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو حضرت بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی۔ خدا کی قدرت اور اسٹن صاحب کی شرافت دیکھو کہ انہیں کی سفارش پر صاحب عالم صاحب قید سے رہا ہوئے دلی آئے، بادشاہ بیگم نے منت بڑھانے کی تیاریاں کیں بڑی دھوم دھام سے چادر گئی، شہر بھر کے تمام ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ قطب میں کئی دن تک میلہ لگا رہا، پھول والوں نے جو مسہری بنائی تو اسمیں خوبصورتی کیلئے ایک پھولوں کا پنکھا بھی لٹکا دیا، سراج الدین ظفر ولیعہد سلطنت نے "پنکھا" کہہ کر گذرانا ؎

نور الطاف و کرم کی ہے یہ سب اسکے جھلک ۔۔۔ کہ وہ ظاہر ہی ملک اور ہے باطن ہیں ملک
اس تماشے کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک ۔۔۔ آفتابی سے خجل جسکے ہے خورشید فلک
یہ بنا اس شہ اکبر کی بدولت پنکھا

شائق اس سیر کے سب آج ہیں با دیدۂ دل ۔۔۔ واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشم انجم ہو نہ اس سیر پہ کیونکر مائل ۔۔۔ سیر یہ دیکھے ہے وہ بیگم والا منزل
جسکے دیواں کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک ۔۔۔ ڈوبے ہیں رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگیں ہے رعیت سے لگا شاہ تلک ۔۔۔ زعفراں زار ہے اک بام سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

بادشاہ کو یہ میلہ بہت پسند آیا، دلی والوں سے کہا کہ اگر ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے تو کیسا؟ مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں

ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں، میلہ کا میلہ ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے بھلا نگی اور پوچھ پوچھ۔ دلّی والے راضی ہو گئے، لیجئے پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑ گئی بادشاہ سلامت خود قطب جاتے وہاں رہتے، شہزادے میلہ میں شریک ہوتے، بڑھتے بڑھتے یہ میلہ کچھ کا کچھ ہو گیا اسی زمانہ میں یہ گانا چلا۔

قطب کو چلا میرا اکبر ہٹیلا　　　نہ رستے میں جنگل نہ ملتا ہی ٹیلا

بہادر شاہ کے زمانہ میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے، اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس زمانہ میں پھول والوں کی سیر کیسی ہوتی تھی تو آنکھیں بند کر لیجئے دکھائے دیتا ہوں۔

سنہ ۱۲۶۲ھ کا ساون بھی غضب کا ساون تھا یا تو برستا ہی نہ تھا یا برسا تو ایسا برسا کہ جل کے تھل بھر گئے، بدھ بدھ پندرہ دن ہو گئے مینہ نہ آج کھلتا ہے نہ کل اور پانی کا یہ حال ہے کہ دھائیں دھائیں یکساں برسے چلا جاتا ہے، جمنا بڑھ کر نگمبود تک آگئی، کیا گھاٹ میں سے پانی ہو کر شہر میں گھس آیا، چاندنی چوک کی نہر ابل کر کناروں سے نکل گئی، بیچارے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے بڑی بڑی حویلیاں چیں بول گئیں، اڑا ڑا دھم کی آوازیں چلی آرہی ہیں، اس مکان کی چھت بیٹھی اسکا پاکھا گرا، شاید ہی کوئی مکان ہو گا جسکی کم سے کم چھت نہ بیٹھی ہو، غریب غربا گھر چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ جامع مسجد کے نیچے سامان کا ڈھیر ہو گیا کسی نے پلنگ بچھا اوپر سے دری ڈال چھوٹی سی کوٹھری بنالی، کسی نے چھپر کھٹ کے گرد چادر گھیر عورتوں کے لئے جگہ نکال لی۔ غرض ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ دو سال

پہلے بھی ڈھائی ڈھوئی کا مینہ برسا تھا، مگر یہ تو کچھ اور ہی رنگ تھا۔ بنئے اپنی مصیبت میں مبتلا تھے بھٹیارے اپنے حال میں گرفتار، آخر ہیں تو کہاں رہیں اور کھائیں تو کیا کھائیں۔

دلی میں بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے، سارا انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا، بھلا کمپنی کو کیا غرض پڑی تھی، جوان غریب دلی والوں کی خبر لے، شہر والے جانیں اور انکا کام جانے۔ خیر۔ بادشاہ سلامت کو خبر ہوئی بیچارے سے جو کچھ اختیار میں تھا وہ کیا۔ سارے سرکاری مکان کھلوا دیئے، کوٹ قاسم کی مالگذاری انہی دنوں میں آئی تھی وہ سب کی سب اس مصیبت ماری رعیت پر خرچ کر دی مسلمانوں کو دونوں وقت کھانا پہنچایا، ہندوؤں کو غلہ دیا، سر چھپانے کو جگہ دی، غرض یہ مصیبت کے دن بھی کسی نہ کسی طرح گذر گئے، سولھویں دن ذرا پانی نے دم لیا، ابر چھٹا، سورج کا کونا دکھائی دیا، لوگوں کی جان میں جان آئی دو چار روز مکانوں کی مرمت اور درستی میں لگے، اس کے بعد یاروں کو میلہ کی سوجھی۔

بھلا جمنا ایسی بھرپور چلے اور دلی والے چپکے بیٹھے رہیں، ڈھنڈورا پٹ گیا کہ کل تیراکی کا میلہ ہے، صبح سے قلعہ کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہونے لگا، آٹھ نو بجے تک تو یہ حالت ہو گئی کہ شہر خالی ہو گیا بیلہ[1] آباد ہو گیا، پنواڑیوں کاچھیوں، بساطیوں سوداگروں، غرض ہر قسم کے سودے والوں کی دوکانیں لگ گئیں، جنگل میں منگل ہو گیا بادشاہ سلامت بھی نکل ثمن[2] برج میں آ بیٹھے، شہزادوں کیلئے دیوان خاص کے

[1] جمنا کی ریتی کے برابر جھاؤ کا جو جنگل ہے اسے بیلہ کہتے ہیں۔ [2] قلعہ میں تسبیح خانہ سے ملا ہوا یہ ایک ہشت پہل برج ہے۔ نام تو اسکا مثمن برج ہے لیکن دلی والے اسکو ثمن برج کہتے ہیں

صحن میں فرش ہوگیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کیلئے موتی محل، خاص محل اور اسد برج کی جالیوں کے سامنے مسندیں بچھ گئیں، تیراکوں کے استاد اپنے اپنے شاگردوں کو لے جمنا میں اترے اور تیراکی کے کمال دکھانے شروع کئے کوئی چت تیرا تو اس طرح گویا تختہ بہا چلا آتا ہے، کسی نے ٹھڑی ماری تو ایسی کہ گھٹنے تک پانی سے باہر نکل آیا کوئی ہے کہ گٹھڑی بنا بہاؤ پہ چلا جاتا ہے، کوئی تیر کے ہاتھ مارتا چڑھاؤ پر سینہ چڑھ رہا ہے۔ ادھر تیراکی ہورہی تھی ادھر قلعہ والوں اور شہر والوں میں کنکوے بازی شروع ہوئی، تکلیں لڑیں تو ایسی کہ چکراتی چکراتی مقبرہ[1] سے آگے نکل گئیں، پتنگ لڑے تو ایسے کہ سارا آسمان کنکووں سے چھپ گیا، غرض یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو دن پہلے اس شہر میں آفت بپا تھی، شام ہوتے ہوتے میلہ بچھڑنا شروع ہوا، رات کے نو دس بجے بیلہ پھر وہی جنگل کا جنگل ہوگیا۔ ہاں دونوں اور آبخوروں کے ڈھیر، پیکوں کے نشان اور چھلکوں کے انبار یہ ضرور بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بڑا شہر تھا جو دم بھر میں بسا اور دم بھر میں غائب ہوگیا۔

ساون ختم ہوا بھادوں لگا، جھڑیوں کا زمانہ گیا پھوار کا زمانہ آیا، دلی والوں کے دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی، قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا پھول والوں کی سیر کی سوجھی، شرفاء دہلی میں سے دو ہندو اور دو مسلمان لال حویلی[2] پہونچے۔ اطلاع کرائی باریابی ہوئی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد

---

[1] مقبرہ سے مراد ہمایوں کا مقبرہ ہے یہ عمارت دلی سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

[2] دلی کے لال قلعہ کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہتے ہیں حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کا شعر ہے

مری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں
دہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے

حرف مطلب زبان پر لائے۔ کہا پیر دمرشد! پھول والوں کی سیر کا زمانہ آگیا ہے جھرنا اور شمسی تالاب بھر کر کٹورہ ہوگئے ہیں، کوئی تاریخ مقرر فرمادی جائے اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب۔ بادشاہ نے فرمایا: ماں اماں[۱] ٹھیک تو ہے جو تمہاری خوشی وہ ہماری خوشی۔ ۱۵ تاریخ مقرر کردو، رہا ہمارا آنا تو جہاں تم وہاں ہم کیوں نہ آئینگے۔ تاریخ مقرر ہونا تھی کہ شاہی روشن چوکی کا شہنائی نواز چاندی کی نفیری ہاتھ میں لیئے حاضر ہوا۔ نفیری پر شادیانہ بجا، لیجئے سیر کی پندرہ تاریخ مقرر ہوگئی۔ سارے شہر میں نفیری بج گئی کہ پندرھویں کو پھول والوں کی سیر ہے، لوگوں نے تیاریاں شروع کیں، بادشاہ سلامت دربار خاص سے اٹھکر تسبیح خانہ میں گئے ہی تھے کہ تمام بیگمات اور شہزادیاں جمع ہونی شروع ہوئیں، ایک آتیں سلام کرکے بیٹھ جاتیں دوسری آتیں بیٹھ جاتیں، تھوڑی دیر میں سارا قلعہ تسبیح خانہ میں جمع ہوگیا، لیکن سب ہیں کہ منہ سے چپ ہیں، مگر نگاہیں صاف کہہ رہی ہیں کہ قطب چلیئے۔ بادشاہ سلامت بھی سمجھ گئے۔ فرمایا:۔

اماں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا، سیر کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ آج دس ہے

---

[۱] آخر زمانہ میں شاہان دہلی انہی معنوں میں اماں کا لفظ استعمال کرتے تھے جنھیں ہم آجکل بھئی کا لفظ بولتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا یہ خیال تھا کہ یہ لفظ شاید "اے میاں" کا مخفف ہے، چنانچہ اب بھی دہلی میں اے میاں کو مخفف کرکے امیاں بولتے ہیں، اس خیال کو مدنظر رکھکر میں نے دہلی کے شہزادوں سے اسکی بکر تحقیق کی معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت اس لفظ کو اپنے اصلی یعنی "ماں" کے معنوں میں استعمال کرتے تھے، اس لفظ کا استعمال حیدرآباد دکن میں اب بھی عام طور سے ہوتا ہے۔

پندرہ کوس ہے، اچھا ہو کہ سب سے پہلے ہم چلے چلیں بعد میں۔ گئے تو شہر والوں کو تکلیف ہوگی دو تین دن قطب کا لطف اٹھالو، اور پھر قطب دلی والوں کے سپرد کر دو۔ تو جاؤ چلنے کی تیاری کرو۔ انشاء اللہ کل سویرے سویرے روانہ ہونگے، اور وہاں، میاں دارا[1] تم ہماری سواری کا بندوبست کرو۔ کوتوال سے کہدو، قلعہ دار سے کہدو، حکیم صاحب[2] سے میں خود کہہ دوں گا۔ کل صبح سویرے نکل گئے تو سلطان جی ہوتے ہوئے شام تک انشاء اللہ قطب پہونچ جائیں گے، یہ سب لوگ تو اتنا سننے کیلئے جمع ہی ہوئے تھے ایک ایک اٹھ مجرا کر رخصت ہوا، سامان بندھنے لگا، سامان بندھتا اور داروغہ توشکچی کے پاس پہونچ جاتا تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ بیسیوں پیٹیاں، سیکڑوں بوغبند، ہزاروں لاکھوں پوٹلیاں، غرض الم غلم منوں سامان جمع ہوگیا، کچھ چھکڑوں میں لادا گیا کچھ اونٹوں پر چڑھایا گیا کچھ شکرموں[3] میں رکھا گیا، کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا کہ سامان چلنا شروع ہوا، خدا خدا کر کے کہیں دو بجے اس لین ڈوری کا تانتا ختم ہوا اس وقت کہیں جا کر بیچارے داروغہ کو دم لینے کی فرصت ملی، ابھی پوری طرح دم نہ لیا تھا کہ اردا بیگنی نے حکم پہونچایا کہ حضرت جہاں پناہ کا ارشاد ہے کہ توشک خانہ شاہی کا جنگلی محل میں قیام ہوگا، اس لئے خیموں، سراپردوں اور شامیانوں کے بھیجنے کی فرصت

---

[1] مرزا دارا بخت ولی عہد سلطنت تھے۔

[2] احترام الدولہ عمدۃ الحکما، معتمد الملک حاذق الزماں حکیم احسن اللہ خاں ثابت جنگ بہادر وزیر اعظم تھے ان ہی کی شہادت نے بیچارے بادشاہ کو رنگون دکھایا۔

[3] اونٹ گاڑی کو پہلے شکرم کہتے تھے، پھر یہ لفظ بند گھوڑا گاڑی کے لئے بھی بولا جانے لگا۔

نہیں ہے۔ ہاں دتی والے اگر یہ سامان طلب کریں تو دیدیا جائے۔ دوسرے حکم کا انتظار نہ کیا جائے اور حکیم صاحب کے ذریعہ سے شہر کے لوگوں کو اس حکم کی اطلاع کرادی جائے۔ حکم پہنچا تھا کہ داروغہ صاحب پھر کمر باندھ اپنے بیٹیں دستوں کو لے سرکاری سامان باندھنے کی فکر میں لگ گئے۔ یہاں انتظام والے تو اپنی مصیبت میں گرفتار تھے اور وہاں قلعہ والوں کی یہ حالت تھی کہ گویا شادی رچی ہوئی ہے۔ چوڑی والیاں بیٹھی دھانی چوڑیاں پہنا رہی ہیں۔ رنگریزنیں سرخ دوپٹے رنگ رہی ہیں کہیں مہندی پس رہی ہے کہیں کڑاہیاں نکالی جا رہی ہیں۔ کہاں کا کھانا اور کہاں کا سونا۔ اسی گڑبڑ میں رات کے بارہ بجادیئے۔ کوئی دو بجے ہونگے کہ سواری کا بگل ہوا۔ قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے نوبت خانہ سے ملا ہوا جو میدان ہے اس میں سواریاں آ لگیں۔ انائیں مغلانیاں خواصیں[۱] چھوکریاں۔ لونڈیاں۔ سریتیں[۲] سوار ہونا شروع ہوئیں۔ بہار کسوں۔ منجھولیوں اور بہلیوں میں وہ ٹھسا ٹھس ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ سانگیوں[۳] اور ماچیوں[۳] میں پہلے تو اٹا اٹ سامان بھرا۔ اوپر سے بھی دو دو تین تین چھوکریاں اور مامائیں دھنس گئیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ بیل لگائے

---

[۱] اس زمانہ میں بیگمات اور شہزادیوں کی مصاحبوں کو خواص کہتے تھے۔ درجہ میں یہ مغلانیوں سے بڑی ہوتی تھیں۔

[۲] زر خرید لونڈیاں سریتیں کہلاتی تھیں۔ سریہ عربی میں لونڈی کو کہتے ہیں۔

[۳] رتھ بہار کسوں اور بہلیوں کے سامنے بانس باندھ کر اور سوت کا جال بنا کر جو جگہ نکال لیتے ہیں اس کو سانگی اور اسی طرح پیچھے گھاس بھر کر جو جھولی سی بنا لیتے ہیں اس کو ماچی کہتے ہیں۔

گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ ہر مشعلچی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھوں میں لے ساتھ ہوتے یہ لوگ قلعہ سے باہر ہی ہوئے ہونگے کہ بیگمات اور شہزادیوں کیلئے رتھیں ڈولیاں نیمے[^1] میانے[^2] پالکیاں چوپہلے[^3] کھڈول اور سکھپال موتی محل کے برابر آگئے شہزادہ ولی عہد بہادر بھی نکل آئے۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے راستے بند کئے برکنولوں اور گرجنوں نے قناتیں کھینچیں۔ جو بیگم یا شہزادی باہر آئیں ان کو بلحاظ ان کے درجے کے سواری ملتی۔ ہر سواری کے ساتھ ایک قلماقنی اور ایک اردابیگنی مقرر ہو جاتی۔ تین سوا تین بجے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی آگے آگے رتھیں ان کے پیچھے دوسری سواریاں سب سے آخر میں نواب زینت محل کا سکھپال۔ لاہوری دروازہ پر سواری پہنچی تھی کہ کپتان ڈگلس قلعدار نے اتر کر سلامی دی۔ دروازے کے باہر سے دگلہ پلٹن کا ایک پرا آگے ہو گیا اور ایک پیچھے شہزادیوں کی سواری کے ادھر ادھر قلماقنیاں مردانہ لباس پہنے کھڑکی دار پگڑیاں باندھے ساتوں ہتیار سجائے ساتھ ہوئیں۔ بیگمات کی سواریوں کو ترکنیوں کی پلٹنوں نے بیچ میں لیا۔ ان کا بھی مردانہ فوجی لباس۔ گورے گورے چہرے۔ شانوں پر کاکلیں پڑی ہوئی۔ سر پہ چھوٹا سا عمامہ۔ اس پر سفید پروں کی اونچی سی کلغی۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں۔ پشت پر ترکش۔ شانہ پر کمان۔ پہلو میں تلوار۔ ڈاب میں پیش قبض۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلی میں گھس آئی ہے۔ نواب زینت محل کی سواری کا بڑا ٹھاٹ تھا۔ آگے آگے دو حبشنیں۔ گھونگریالے بال ان پہ

---

[^1]: [^2]: [^3]: آدمی پالکی کو نیمہ کہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے اس سے بڑی میانہ ہے چوپہلے بھی پالکی کی وضع کے ہوتے ہیں مگر ان کی شکل بجائے مستطیل کے چوکور ہوتی ہے۔

سرخ پگڑیاں پگڑیوں میں سفید مقیش کے پھندنے - موٹے موٹے ہونٹ - لال لال دیدے سرخ گورنٹ کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ - گھوڑوں پر سوار - ہاتھوں میں پتلی پتلی چوبیں سامنے گھوڑوں کی پشت پر زربفت سے منڈھے ہوئے ڈنکے پر ایک چوب مارتی - دوسری پکارتی "ادب سے نگاہ روبرو حضرت بادشاہ بیگم سلامت" سکھپال کے دونوں طرف دو دو گرجنیں ایک کے ہاتھ میں مورچھل دوسری کے ہاتھ میں چنور - ہر ہر قدم پر بسم اللہ بسم اللہ کہتی چلی آتی تھیں - سب سے پیچھے اردا بیگنوں کی پلٹنیں مردانہ لباس پہنے ہتیار لگائے اوچی ہی ساتھ ساتھ تھیں - تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مشعلچنیں کسی کے ہاتھ میں مشعل اور کپی - کسی کے ہاتھ میں دوشاخہ اور کسی کے ہاتھ میں پنجشاخہ سواری کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں - یہ جلوس دلی دروازہ تک تو اسی سلسلہ سے گیا - دروازہ کے باہر نکل کر رتھیں تو ترکمان دروازہ سے ہوتی ہوئی قطب کی سڑک پر پڑلیں - اور دوسری سواریاں دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گئیں -

کوئی چار بجے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت بیدار ہوئے - حوائج ضروری سے

۱؎ نواب زینت محل خاندانِ شاہی سے نہ تھیں - نواب علی قلی خاں کے خاندان میں نواب شمشیر الدولہ کی لڑکی سے بادشاہ نے بڑھاپے میں شادی کی تھی - خدا کی قدرت سے اولاد ہوئی - جواں بخت نام رکھا گیا - انھی کی ولیعہدی کے جھگڑوں نے قلعہ میں تفرقہ ڈالا بیگم کی محبت میں بادشاہ ایسے گرفتار تھے کہ جو چاہتیں بلا چون و چرا کرتے - آخر انھی مخالفتوں نے رنگون پہنچا دیا - یہ بیگم جب نکلتیں ڈنکا ان کے ساتھ ہوتا اسی لئے ان کو ڈنکے والی کہا جاتا - قلعہ میں کم رہتی تھیں - لال کنوئیں پر نیا محل بنوایا تھا - غدر کے بعد وہ محل پٹیالہ والوں کو ملا - اب وہ بھی ٹھکانے لگا -

فارغ ہو کر گڑ[1] کا شربت پی کر معدہ صاف کیا۔ خانساماں نے یاقوتی کی سربمہر پیالی پیش کی۔ مہر توڑ کر یاقوتی نوش جان کی اور فرمایا "اماں سب لوگ سدھارے؟" عرض کی جہاں پناہ کے اقبال سے سب انتظام ہو گیا۔ میر تزک[2] حاضر ہیں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ فرمایا۔ "اچھا بسم اللہ کرو" یہ حکم ہوتا تھا کہ بگل ہوا۔ ولی عہد بہادر کے لئے تام جھام۔ مرزا شاہرخ کے لئے تخت رواں۔ مرزا فخرو کے لئے بوچہ اور خود بادشاہ سلامت کیلئے ہوادار دیوان خاص میں آگیا۔ باقی سب شاہزادے اور سلاطین زادے گھوڑوں پر سوار ہوتے۔ ادھر بادشاہ سلامت نے ہوادار میں قدم رکھا اور ادھر چوبدار نے آواز لگائی "ادب سے تعظیم سے مجرا بجا لاؤ حضرت بادشاہ سلامت" شہزادوں نے تلوار میان سے نکال سلامی دی دوسرے لوگ جھک کر آداب بجا لاتے۔ بادشاہ کے بعد ولی عہد بہادر، مرزا شاہرخ اور مرزا فخرو سوار ہوئے ہوادار کے پیچھے ایک خواصی نے چتر شاہی کھولا۔ دوسرے نے سورج مکھی لی اور یہ جلوس آہستہ آہستہ قلعہ کے دہلی دروازے کی طرف چلا دروازہ

---

[1] بہادر شاہ مرحوم کا دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی گڑ کا شربت پی کر جوں کا توں نکال دیتے تھے اس طرح کل رطوبات فاسدہ خارج ہو کر معدہ صاف ہو جاتا۔

[2] قلعہ میں میر تزک کا بڑا درجہ تھا۔ دربار اور جلوس کا انتظام اور لوگوں کو باریاب کرانے کی خدمت انہی کے سپرد تھی ایک یہی شخص تھے جن کو دربار میں جریب لے کر کھڑے ہونے کی اجازت تھی۔ ذرا کسی نے آداب شاہی میں ادنی نیچ کی اور انہوں نے کھٹ سے جریب پاؤں پر ماری۔ یہ خدمت سعادت خاں رنگین کے خاندان میں مدت تک رہی۔

کے باہر پہلے سے فوج کی مِسل بندھی ہوئی تھی۔ سب سے آگے نشان کا ہاتھی اس پر شاہی پرچم، اس کے پیچھے نقارہ کا اونٹ۔ اونٹوں کے بعد ترک[1] سواروں کا رسالہ۔ رسالہ کے بعد روشن چوکی کے تخت۔ تختوں کے پیچھے میر تزک۔ اس کے بعد سلاطین زادوں کی سواریاں۔ شہزادوں کے گھوڑے، مرزا فخرو کا بوچہ۔ مرزا شاہ رُخ کا تختِ رواں۔ مرزا دارا بخت کا نام جھام۔ ان کے پیچھے دور باش[2] اور دور باش کے پیچھے بادشاہ سلامت کا ہوادار۔ ہوادار کے پیچھے فوج کا پرا۔ آخر میں قلعہ کے نوکر چاکر بھیڑ و نبگاہ۔ سڑک کے کنارے کنارے مشعلچیوں کی قطاریں۔ غرض قلعہ کے دلی دروازے[3] سے جو مسل بندھی تو پُرانے کوٹلہ پر جا کر ختم ہوئی۔ سواری قلعہ سے نکلی ہی تھی کہ شہدوں نے غل مچایا "حضرت پیر و مرشد ہمارا بھی حق ملجائے۔ خدا تعالیٰ عمر و اقبال میں ترقی کرے آمین۔ اور صد دسی سال یہ سایہ دلی والوں کے سروں پر قایم رہے۔ آمین خدا شہزادے شہزادیوں کو سلامت رکھے۔ آمین۔ سیر آ رہی ہے۔ کچھ ایسا ملے کہ ہم بھی جہاں پناہ کے صدقے میں سیر کی بہار دیکھ لیں۔" بادشاہ سلامت نے

---

[1] دلی کی جو فوج انگریزی لباس اور انگریزی ہتیاروں سے آراستہ تھی اس کو ترک سوار کہتے تھے وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ترکوں کا بھی یہی فوجی لباس تھا۔

[2] دور باش ایک خوبصورت رنگین شہتیر ہوتا تھا جس پر برچھیاں لگی ہوتی تھیں۔ یہ سواری کے آگے آگے ہوتا تھا کہ کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کر بیٹھے۔

[3] قلعہ کے دو دروازہ ہیں۔ لاہوری دروازہ اور دلی دروازہ۔ شہر پناہ کے دروازوں کے بھی یہی نام ہیں۔ لاہوری دروازہ کھاری باؤلی کے کنارہ پر تھا وہ تو زمین کے برابر کر دیا گیا۔ ہاں دلی دروازہ موجود ہے فیض بازار کے سرے پر ہے اور اسی میں سے ہو کر پرانے قلعہ کو سڑک گئی ہے۔

اشارہ کیا۔ خواصی نے مٹھیاں بھر بھر کر روپیے ہوادار پر سے نچھاور کئے۔ پھر کیا تھا روپیوں کے ساتھ شہدے سڑک پر بچھ گئے کسی نے ہاتھ پھیلائے کسی نے جھولی پھیلائی۔ سواری چلنی مشکل ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک یہی ہنگامہ رہا۔ جب دل بھر کر روپیہ لوٹ چکے تو شہدے دعائیں دیتے آگے بڑھے اور ہوادار آگے بڑھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے خبر ہوگئی تھی کہ آج پچھلی رات کو سواری مبارک قطب جائیگی۔ رات کے بارہ بجے ہی سے خاص بازار سے لگا فیض بازار اور شہر کے دلی دروازہ تک خلقت کا ہجوم تھا۔ بازاروں میں آدمیوں کے کٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ چھتوں اور کمروں پر ہزارہا عورتیں بیٹھی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے بادشاہ کو دیکھنے کیلئے بیچین تھا۔ وقت کم تھا اس لئے بازاروں میں آئینہ بندی تو نہیں ہوئی تھی ہاں بعض بعض مکانوں کے دروازے، کمرے کے رد کار اور دکانیں سجا کر روشنی کردی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ ان سڑکوں پر سے گذرا۔ ایک سناٹے کا عالم تھا مگر ہر شخص کے بشرے اور آنکھوں سے جوش ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی اس جوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک پھریری سی آئی اور آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ آئے۔ کیا خبر تھی کہ نو برس نہ گذرینگے کہ اسی سڑک پر سے گذرنا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ سڑک ویران ہوگی۔ دلی والے تباہ ہوں گے گولوں کی مار سے مکانات مسمار ہونگے اور بے گناہوں کے خون سے زمین رنگین ہوگی اس کے چند ہی دن بعد اس سڑک سے پھر شہر میں داخل ہونا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ خود قید ہونگے چاروں طرف جنگی پہرہ ہوگا۔ بیٹوں۔ بھانجوں اور بھتیجوں کی لاشیں میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہونگی۔

محل ویران ہوگئے اور محل والیاں خدا جانے کہاں ہونگی اور کس حالت میں ہونگی۔
غرض سواری مبارک ان سڑکوں پر سے گذر کر دلی دروازہ پہنچی۔ محافظوں نے سلامی دی اور جلوس سلطان جی[1] کی سڑک پر گیا۔ جو زنانہ سواریاں پہلے سے روانہ ہوکر یہاں ٹھیری ہوئی تھیں وہ بھی جلوس کے آخر میں شریک ہوگئیں کہاروں نے یہاں سے ذرا اقدام تیز کر دیئے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے سواری پرانے قلعہ پہنچ گئی شیر شاہ کی مسجد کے سامنے ہوادار رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے مسجد میں نماز پڑھی وظیفہ پڑھا۔ کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کرکے یہاں سے سواری بڑھی اور ابھی دن اچھی طرح نہ نکلا تھا کہ ہمایوں کے مقبرہ پہنچ گئی۔ مقبرہ میں پردہ ہوگیا۔ سواریاں اتریں۔ باہر کے دروازہ سے بادشاہ سلامت کا ہوادار کہاروں نے سنبھال لیا اور مقبرہ کے دروازہ پر جا لگایا۔ سامنے کے صحن میں پہلے سے فرش ہوگیا تھا۔ مسند بچھی ہوئی تھی۔ بادشاہ سلامت مسند پر جا بیٹھے وظیفہ ختم کیا۔ مقبرہ کے اندر گئے۔ خاندان شاہی کے سیکڑوں لوگ اس مقبرہ میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہر ایک کی قبر پر جاکر فاتحہ پڑھی۔ شاہزادے ساتھ تھے سب کو ایک ایک قبر دکھاتے۔ نام بتاتے۔ ان کے کارنامے سناتے۔ اپنی اور ان کی حالت کا مقابلہ کرتے اور بے اختیار روتے[2]
فاتحہ سے فارغ ہوکر پھر ہوادار میں سوار ہوئے اور جس ترتیب سے یہ قافلہ آیا

[1] حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں ان کا مزار مبارک دلی دروازہ سے تین میل پر ہمایوں کے مقبرہ کے بالکل سامنے ہے۔

[2] آخر میں بہادر شاہ کا دل ایسا رقیق ہوگیا تھا کہ بات بات پر آنسو نکل آتے تھے۔

تھا اسی ترتیب سے آگے بڑھا۔ درگاہ شریف قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہونچ گئے۔ دلّی والوں کو اس درگاہ سے جو خاص عقیدت ہے وہ بیان نہیں ہوسکتی کسی قوم اور کسی ملّت کا آدمی نہیں جو اس چوکھٹ پر سر نہ جھکاتا ہو اور کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو نامراد جاتا ہو۔ پردہ کا انتظام پہلے سے ہوگیا تھا ہوادار باولی پر رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اتر کر وضو کیا۔ شہزادوں نے ہاتھ منہ دھویا شہزادیوں کے لئے باولی کے طاقوں کے سامنے اوٹ لگ گئے تھے۔ کسی نے وضو کیا کسی نے غسل کیا۔ کوئی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ بادشاہ سلامت وضو کر ہوادار میں آبیٹھے۔ اردابیگنی نے عرض کی "جہاں پناہ! باولی میں تیرنے کیلئے خادموں کے لڑکے آئے ہیں۔ کیا حکم ہوتا ہے" فرمایا "ہاں اماں ہاں۔ بلاؤ۔ وہ حق دار ہیں اپنا حق لینے آئے ہیں۔ کیوں نہ ملیگا۔ ضرور ملیگا۔ حکم ہونا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کے بیس پچیس لڑکے اندر آئے۔ مجرا بجالائے۔ اجازت چاہی اور گنبد پر چڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر سے بیگمات اور شہزادیوں نے روپیے پھینکنے شروع کئے۔ ادھر روپیہ گرا اور ادھر کوئی لڑکا گنبد پر سے کودا۔ ڈبکی لگائی اور روپیہ نکال لایا۔ تھوڑی دیر تک یہی تماشا رہا اس کے بعد سب کے سب درگاہ شریف میں گئے۔ پہلے حضرت امیر خسروؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی وہاں سے حضرت سلطان جی کے مزار پر آئے۔ بادشاہ سلامت تو اندر چلے گئے عورتوں نے گنبد شریف کے دروازہ پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ کسی نے زنجیر پکڑ کر دعا مانگی۔ کسی نے چوکھٹ کی مٹی لیکر منہ پر ملی۔ کسی نے گود پھیلا کر دل ہی دل میں تلاوت شروع کی کسی نے مسجد کے کٹورے کا قصہ شروع کیا۔ دیکھتا ہوا یہ کٹورہ سونے کا ہے۔ بڑا بھاری ہے

کئی سیر کا ہوگا۔ دادا جان کے زمانہ میں ایک بڑھیا مصیبت کی ماری درگاہ شریف میں آئی اور عرض کی یا حضرت سات بیٹیاں ہیں۔ کھانے کو پیسہ پاس نہیں یہ پہاڑ کیونکر اُٹھیں گے آپ ہی یہ مشکل آسان کیجئے۔ وہاں سے اُٹھ کر جو تسبیح خانہ میں آئی تو کٹورا گنبد سے اتر کر اُس کی گود میں آگیا۔ خوشی خوشی گھر آئی بڑی دھوم دھام سے بیٹیوں کی شادیاں رچائیں۔ مزے سے ہنسی خوشی رہنے لگی۔ دلی کے ایک امیر تھے۔ ان کو جو یہ خبر ہوئی تو انھوں نے بھی درگاہ میں جا کر دعا مانگی۔ وہاں سے اس مسجد میں آئے۔ بڑی دیر تک کٹورہ کو دیکھتے رہے۔ کٹورہ جہاں تھا وہیں رہا۔ چل گئے۔ مزدوروں کو بلوایا۔ باڑھ باندھی۔ جتنی باڑھ اونچی ہوتی کٹورہ اور اونچا ہوتا جاتا۔ باڑھ گنبد کی چھت تک پہونچی تو کٹورہ غائب ہوگیا۔ ادھر باڑھ کھلی ادھر کٹورہ اپنی جگہ پر آموجود ہوا۔ سچ ہے لالچ بُری بلا ہے کٹورہ تو کیا ملتا۔ باڑھ باندھنے کا خرچ مفت گلے پڑا۔

بادشاہ سلامت فاتحہ سے فارغ ہو درگاہ شریف سے باہر آئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے مزار۔ مرزا جہانگیر[1]۔ مرزا نیلی[2] اور جہاں آرا بیگم کی قبر پر گئے۔ فاتحہ پڑھی

---

[1] مرزا جہانگیر دہلی شہزادہ ہیں جنکی وجہ سے پھولوں کی سیر قائم ہوئی۔ واپس آنے کے بعد انھوں نے پھر بے اعتدالیاں کیں پھر الہ آباد بھیج دیئے گئے۔ اور وہیں انتقال ہوگیا۔ نواب ممتاز محل نے انکی لاش الہ آباد سے منگوالی اور سلطانجی میں ایک نہایت خوبصورت سنگ مرمر کا محجر بنوا کر دفن کر دیا۔ [2] مرزا نیلی شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے تھے انتقال کے بعد انکو بھی مرزا جہانگیر کے محجر میں دفن کیا گیا۔ [3] جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی بیٹی تھیں۔ حضرت سلطان المشائخ سے بڑی عقیدت تھی ان کا مزار درگاہ کے پائنتی ایک سنگ مرمر کے محجر بنا ہے۔ سرہانے کتبہ لگا ہوا ہے کتبہ کا یہ شعر بڑا دردناک ہے ؎ بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

یہاں سے پھر باؤلی پر آتے۔ خادموں کو انعام دیتے۔ فقیروں کو خیرات تقسیم کی۔ اور وہاں سے نکل منصور کے مقبرہ کی سیدھی سڑک پر ہو گئے۔ یہاں دو ڈھائی گھنٹے آرام کیا۔ خاصہ تناول فرمایا۔ کوئی چار بجے یہاں سے روانہ ہو شام ہوتے ہوتے قطب پہنچ گئے جنگلی محل اور مرزا بابر کی کوٹھی پہلے سے آراستہ تھی جو سواریاں سیدھی قطب آئی تھیں انھوں نے سب سامان قرینے سے جما دیا تھا۔ خاصہ تیار تھا۔ دن بھر کے سب تھکے ماندے تھے۔ کھایا۔ نماز پڑھا ایسے سوئے کہ جب چار بجے کی نوبت بجی اس وقت کہیں جا کر آنکھ کھلی۔

جنگلی محل اب تو واقعی جنگلی محل ہے۔ ہاں کسی زمانہ میں بڑا غدار محل تھا۔ پہلے ہی کچھ کم بڑا نہ تھا۔ بہادر شاہ نے دیوانِ خاص۔ دیوان عام۔ خاص محل اور باب ظفر بنوا کر اس کو اور بڑا کر دیا۔ دروازہ کیا ہے خود ایک چھوٹا سا محل ہے سر تا پا سنگ سرخ کا ہے رو کار پر سنگ مرمر کی پٹیاں حاشیہ اور پھول ویر اس کی رونق کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ دروازہ کی بلندی کوئی ۱۶-۱۷ گز ہے پہلو میں ۷۷ سیڑھیوں کا چکر دار زینہ ہے۔ محراب کے عین اوپر شاہی بارہ دری ہے یہیں سے بیٹھکر بادشاہ سلامت اور بیگمات پنکھوں کا تماشہ دیکھتے تھے۔ دروازہ سے ملا ہوا درگاہ شریف کا دروازہ ہے جھرنے سے پنکھے اٹھکر ادھر آتے۔ پہلے دن جوگ مایا جی کا پنکھا اٹھتا دوسرے دن پنکھا تو برابر والے دروازہ سے مزار شریف

ٰلہ مرزا بابر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ انکی ایک بڑی انگریزی وضع کی کوٹھی اب تک قطب میں موجود ہے اس کا ایک دروازہ تو درگاہ شریف میں ہے دوسرا جنگلی محل میں تیسرا جنگل میں جھرنے کی طرف نکلتا ہے

پر چلا جاتا۔ جوگ بابا جی کا نیکھا شاہی دروازہ کے سامنے کچھ دیر رُکتا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا اندر چلا جاتا۔ باب ظفر کا اندر کا حصہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بڑے پھاٹک سے لگا کر اندر محل تک سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ پھر ہر ڈیوڑھی پر پہرہ داروں کیلئے سہ دریاں بنی ہوئی ہیں پھاٹک پر تو دلکہ پلٹن کا پہرہ تھا اندر کی ڈیوڑھیوں پر ترکنوں[1] قلماقنیوں[2] اردابیگنیوں[3] حبشنوں[4] اور گرجنوں[5] کی نشست ہوتی۔ بھلا کیا مجال کہ محل میں پرندہ تو پر مار جائے پھاٹک سے گھستے ہی اُلٹی طرف پہلی ڈیوڑھی کے پاس سے مردانہ کو راستہ جاتا تھا غرض اس محل میں اتنی گنجائش تھی کہ سارا قلعہ اس میں سما جاتا اور پھر بھی جگہ رہتی۔

---

[1] آخر زمانہ میں ترکستان، حبش اور گرجستان سے عورتوں کی آمد بند ہو گئی تھی پہلے سے جو خاندان دلی میں بس گئے تھے انھیں میں سے یہ پلٹنیں بھرتی کی جاتیں۔ لباس ان سب کا مردوں کا سا ہوتا۔ یہ سب مردانہ کرتب جانتی تھیں۔ ان کا کام محلوں میں پہرہ دینا تھا۔

[2] قلماقنیاں پہرہ دینے اور حکم احکام پہنچانے پر مقرر تھیں۔ ان کے لباس کا ذکر اوپر آچکا ہے ان کو شادی کرنا ممنوع تھا

[3] اردابیگنیاں بھی محل کا انتظام کرتیں اور احکام پہنچاتیں۔ ان کا صرف مردانہ لباس ہی نہ ہوتا تھا بلکہ نام بھی مردوں کے سے ہوتے تھے۔ گفتگو بھی مردوں کی طرح کھڑی کھڑی زبان میں کرتی تھیں تھیں تو عورتیں مگر شکل صورت وضع قطع چال ڈھال سے بالکل مرد معلوم ہوتی تھیں دلی میں ان کو ہڑدابیگنیاں کہتے تھے پھر یہ لفظ اردو میں ایسی لڑکیوں کیلئے استعمال ہونے لگا جو بڑی دنگئی اور شریر ہوں اور جن پر سودا کا یہ شعر صادق آتا ہو ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

اب مردانے اور زنانے سب مکانات ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گئے ایک بابِ ظفر رہ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس محل کا یہ دروازہ ہے وہ محل کیا ہوگا۔ بادشاہ کی کہی ہوئی تاریخ دروازہ کی روکار پر کندہ ہے ؂

این درِ عالی چو شد مکرم بنا حسب المراد
گفت دل۔ سالِ بنائے بابِ ظفر پائندہ باد"

سنہ جلوس ۱۲۶۴ھ

زمانہ کے ہاتھوں اس دروازہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو اندر کے محلوں کا ہوا لیکن تو کہو محکمہ آثارِ قدیمہ نے اس کو اپنی نگرانی میں لیکر سنبھال لیا ہے۔

خیر تو صبح کی نوبت بجی تھی کہ محل میں چہل پہل شروع ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کپڑے بدل۔ نماز پڑھ۔ ناشتہ کر سب شہزادے شہزادیاں بادشاہ سلامت کے سلام کو آئیں مطلب تھا کہ چلئے یہاں بیٹھے تھوڑی آئے ہیں۔ جہاں پناہ بھی وظیفہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ سب کا سلام لیا۔ دعائیں دیں۔ ان سب کا مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا "اماں کہاں کا ارادہ ہے جھرنے کا یا قطب صاحب کی لاٹ کا؟" سب نے عرض کی۔ پیر و مرشد! پہلے جھرنے تشریف لے چلئے۔ ابر آیا ہوا ہے اس وقت جھرنے پر بہار ہوگی"۔ فوراً اردابیگنی کو پردہ کرانیکا حکم دیا گیا۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے ناکہ بندی کر دی۔ اردابیگنیوں قلماقنوں نے راستہ کا انتظام کیا۔ شہزادیاں اور گرجینیں بیگمات اور شہزادیوں کے ہمراہ ہوئیں۔ ماماؤں۔ اصیلوں اور خواصوں اور سرتیوں کا غول کا غول نکلا اور سیدھا جھرنے کا رُخ کیا۔ شہزادیوں نے پہلے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں سے مرزا بابر کی کوٹھی میں سے ہو جنگل میں نکل گئیں

پہلے جہاز[1] پر جا کر دم لیا۔ شمسی تالاب کا لطف اٹھایا۔ میلوں تک پانی ہی پانی تھا برجی[2] بیچ میں آ گئی تھی پانی کا یہ عالم دیکھ کے بہتوں کے جی میں آیا کہ کود پڑیں۔ پھر خیال آیا کہ بادشاہ سلامت سے اجازت لئے بغیر پانی میں اترنا ٹھیک نہیں جلدی ہو رہی۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھہر کر سب کے سب اولیا مسجد[3] پہونچے۔ مصلوں پر نفل پڑھے اتنے میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آ گئی۔ شہزادے ساتھ تھے۔ آگے آگے سواری چلی پیچھے پیچھے عورتوں کا یہ غول چلا۔ اولیا مسجد سے مہرنا دور ہی کتنا ہے تھوڑی دیر میں سب کے سب وہاں پہنچ گئے

جس نے پہلے زمانہ کا مہرنا نہیں دیکھا اس نے دلی میں کچھ خاک نہیں دیکھا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بہشت کا ایک کونہ کاٹ کر مہرولی[4] میں جوڑ دیا ہے خدا کی

---

[1] شمسی تالاب کے کنارے ایک جہاز کی شکل کی ایک بہت بڑی اور خوبصورت عمارت قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت کو جہاز کہتے ہیں۔

[2] اسی تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا برج ہے اور برج کے نیچے سنگ خارا پر گھوڑے کے سم کا نشان ہے اس سم کے متعلق عجیب روایتیں مشہور ہیں۔ عام طور سے اس کو براق کا سم کہتے ہیں۔ کنارے سے برجی اتنی دور ہے کہ وہاں تک جاتے جاتے اچھے اچھے تیراکوں کے دم ٹوٹ جاتے ہیں۔

[3] یہ ایک چھوٹی سی مسجد شمسی تالاب کے کنارے پر ہے۔ صحن میں دو مصلے ہیں کہتے ہیں کہ ان مصلوں پر حضرت معین الدین اجمیریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نماز پڑھا کرتے تھے۔

[4] مہرولی ہی کو قطب کہتے ہیں۔ یہ دلی سے گیارہ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں یہاں خاصی رونق ہو گئی تھی وہ قطب کے عاشق تھے۔ جہاں خدا ابر آیا اور انکی سواری قطب چلی کہا کرتے تھے کہ ابر ہمارے قطب جانے کا نقیب ہے۔

قدرت دیکھو کہ یہ بنا کس لیے تھا اور ہو کیا گیا۔ فیروز شاہ تغلق نے شمسی تالاب کا بند باندھ کر اس کا پانی نو لکھی نالہ میں ڈالا تھا اور اس نالہ کو تغلق آباد کے نالوں سے ملا دیا تھا تاکہ قلعہ میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہو گیا۔ نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر ۱۷۰۰ء میں نواب غازی الدین[1] فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کا بند اور سامنے حوض بنوائے نہریں نکالیں۔ فوارے لگائے اور اس ٹکڑے کو بہشت کا نمونہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بارہ دریاں۔ دالان اور مکانات بن گئے۔ چار دیواری کھنچ گئی۔ درخت بڑھ کر جھرنے پہ چھتر ہو گئے اور تھوڑے دنوں میں یہ جگہ کچھ کی کچھ ہو گئی بند سے سوتوں کی شکل میں پانی جھر جھر کر یہاں آتا تھا اس لیے اس مقام کا نام جھرنا ہو گیا۔ بند سے ملا ہوا جو سہ درہ دالان ہے وہی جھرنے کی جان ہے۔ دالان کی چھت اندر سے کھوکھلی ہے۔ بند کا پانی پہلے چھت میں آتا تھا چھت میں درزیں چھوڑ دی ہیں۔ درزوں میں سے پانی اس طرح گرتا ہے گویا دالان میں پانی برس رہا ہے۔ دالان کے سامنے کی جو دیوار ہے اس میں چراغ رکھنے کیلئے سیکڑوں طاق بنے ہوئے ہیں۔ چراغوں کے سامنے پانی کی چادر گرتی ہے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یا تو پانی میں آگ لگا دی یا سونا پگھل پگھل کر بہہ رہا ہے چھت کی منڈیر کے نیچے ۱۳ پرنالے ہیں۔ پرنالوں میں سے پانی ہو کر جھجے پر آتا ہے۔ جھجے کے نیچے ایک بڑا حوض ہے۔ پرنالوں کا پانی جھجے پر پھیل کر

---

[1] نواب غازی الدین فیروز جنگ شاہان دہلی کے وزیر اور آصف جاہ اول کے فرزند تھے۔ یہ وہ غازی الدین فیروز جنگ نہیں ہیں جنھوں نے عالمگیر شاہ ثانی کو کوٹلہ میں شہید کرایا تھا۔

اس زور سے حوض میں گرتا ہے گویا دھواں دھار بارش ہو رہی ہے حوض کے سامنے ۸ گز لمبی ۲ گز چوڑی اور گز بھر گہری ایک نہر ہے۔ حوض کا پانی ابل کر اس نہر میں آتا ہے جہاں نہر ختم ہوتی ہے۔ وہاں سلامی کے پتھر دیکھا ایک چادر سی بنا دی ہے۔ اس سلامی کے پتھر پر ایسی اچھی منبت کاری ہے کہ پانی کی بہنے سے چادر پر مچھلیاں سی تڑپتی معلوم ہوتی ہیں اس چادر کے نیچے شمال اور جنوب سے دو نہروں کے پانی اور آن ملے ہیں۔ آگے چل کر یہ پانی تین نہروں میں بٹ جاتا ہے بڑی نہر تو بارہ دری کے منڈوے کے نیچے سے چلی گئی ہے اور چھوٹی دونوں نہریں پیچ کھا کر منڈوے کے دونوں طرف سے چار دیواری کے باہر سے نکل جاتی ہیں

محمد شاہ کے زمانہ سے لے کر بہادر شاہ تک دلی کا شاید ہی کوئی بادشاہ ہوگا جس نے جھرنہ میں کوئی عمارت نہ بنوائی ہو۔

خود محمد شاہ نے تو بڑی نہر کے اوپر بارہ دری کا منڈوا بنوایا۔ شاہ عالمگیر ثانی نے جنوب کی طرف پنج درہ دالان نکالا۔ اکبر شاہ ثانی نے شمال کی جانب دوہرا دالان تعمیر کیا۔ بیچ میں جو جگہ رہی تھی اس میں بہادر شاہ نے سنگ سرخ کی بارہ دری بنوا کر جھرنہ کی عمارتوں کو مکمل کر دیا۔

جھرنہ کے قریب ہی دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک پھسلنا پتھر دوسرے امریاں۔ پھسلنا پتھر محمد شاہ بادشاہ کی جدت پسند طبیعت کی یادگار ہے۔ یہ

ٹ اس بارہ دری کی چھت نہیں ہے ملکہ ٹٹیاں لگا کر پھولوں کی بیلیں چڑھادی ہیں۔ پھول کھلنے سے ساری چھت ڈھک جاتی ہے۔

پتھر کوئی سوا چھ گز لمبا اور ڈھائی گز چوڑا ہے اور جھرنہ کی مشرقی دیوار سے ملا کر اس کو ذرا جھکا ہوا گاڑ دیا ہے۔ یہ پتھر اس بلا کا چکنا ہے کہ ذرا کوئی بیٹھا اور پھسلا پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا اس پر چڑھنا اور پھسلنا ایک تماشا ہو جاتا ہے اسی پتھر کے استعارہ سے ذوقؔ نے یہ شعر کہا ہے۔

میں کہاں سنگِ درِ یار سے ٹل جاؤنگا　　　کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤنگا

بارہ دری کے منڈھے سے ملا ہوا جھرنہ کا دوسرا دروازہ ہے اور اس کے بعد امرایاں آموں کے درخت تو ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے درختوں پر کچھ اور ہی بہار ہے جھرنہ کے پانی سے بارہ مہینے سرسبز رہتے ہیں اور اتنے گھنے ہو گئے ہیں کہ آسمان بھی مشکل سے نظر آتا ہے ادھر انکی سبزی ادھر نیچے گھاس کی سبزی بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان سبز مخمل کے بن گئے ہیں۔ جھرنہ میں چادروں کا گرنا۔ فواروں کا اُچھلنا پانی کا بہنا اگر جنت نگاہ ہے تو امریوں میں موروں کی جھنکار، پپیہے کی پکار اور کوئل کی کو کو فردوس گوش ہے۔ غرض جھرنہ ایک عجیب چیز تھا کہ ہر موسم میں ایک نیا لطف دکھاتا تھا اور ہر شخص کو نئی لذت بخشتا تھا۔ اب اس کی بھی بہار گئی۔ شمسی تالاب کٹ پھٹ کر حوض بن گیا بند اس سے دو رجا پڑا پانی کا رِسنا موقوف ہوا نہریں خشک ہو گئیں حوض ملبہ سے اٹ گئے درخت سوکھ ساکھ کر کٹ گئے۔ پھسلنا پتھر ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گیا۔ ہاں عمارتیں کھڑی رہ گئیں۔ کچھ دنوں میں ان کا بھی وقت آ جائے گا۔ اس کے بعد جھرنے اور امریوں کا بس نام ہی نام رہ جائے گا سچ ہے ؎

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

تو ہاں۔ بادشاہ سلامت کے جھرنہ پہنچتے ہی قلماقنیوں نے شاہی ہنگورا کھڑا کر اس میں مسند بچھادی۔ ہوادار ہنگورے کے پاس جا لگا۔ بادشاہ اتر اُس میں جا بیٹھے۔ دو خواصیں مورچھل لے پیچھے جا کھڑی ہوئیں دو نے آہستہ آہستہ ہنگورا ہلانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بادشاہ سلامت نے فرمایا "کہو۔ اماں کیا ارادہ ہے اب تیرنا ہوتا ہے یا جھولنا؟"

"اچھا کچھ جھرنہ میں رہو کچھ امریوں میں چلو۔ یہاں بھی لطف اُٹھاؤ وہاں کا بھی مزہ دیکھ لو۔ ہم تو امریوں میں جاتے ہیں" یہ کہہ بادشاہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ٹہلتے ٹہلتے بارہ دری کے دروازہ سے امریوں میں آ گئے۔ یہاں پہلے سے انتظام ہو گیا تھا ایک طرف بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم کے تخت بچھ گئے۔ اور دوسری طرف شہزادیوں کے لئے دری۔ چاندنی اور قالینوں کے فرش کر کے تکئے لگا دیے گئے تھے۔ درختوں میں بیسیوں جھولے پڑ گئے تھے۔ بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے۔ اس کے بعد سب سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے انتظار تھا کہ کب حکم ہو اور کب جھولوں پر جائیں۔

بادشاہ نے فرمایا واہ جی واہ خالی جھولا کیسا۔ کڑھائی چڑھاؤ جھولتے جاؤ اور کھاتے جاؤ۔

ل قلعہ میں شہزادوں اور شہزادیوں دونوں کو مردانہ فن سکھاتے جاتے تھے۔ شاید ہی کوئی ہوگا جس کو تیر چلانا۔ تلوار چلانا۔ بندوق چلانا۔ سوار ہونا اور تیرنا نہ آتا ہو۔ بابر بادشاہ کے زمانہ سے یہ خاندان پانی کا عاشق ہے۔ قلعہ ہی کو دیکھ لو۔ آدھا قلعہ تو نہروں اور حوضوں نے گھیر لیا ہے

تاج محل نے عرض کی "جہاں پناہ ہم پہلے ہی سے یہ انتظام کر کے آئے ہیں حکم کی دیر ہے ابھی سب کچھ ہوا جاتا ہے" یہ کہہ لونڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تو حکم کی منتظر کھڑی ہی تھیں۔ ذرا سی دیر میں بیسیوں کڑھائیاں آگئیں۔ درختوں کی جڑوں میں چولھے لگ گئے کسی کسی بیگم کے سامنے انگیٹھی آگئی۔ اب ہے کہ کوئی تو میٹھا بیسن پھینٹ رہا ہے۔ کوئی گل گلوں کے آٹے میں کھانڈ ملا رہا ہے۔ کوئی سہال اور اندرسے تلنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ کوئی اندرسے کی گولیوں کا سامان نکال رہا ہے کوئی چھاج کھجوریں بنا رہا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں خاصا بازار سا لگ گیا۔ جب سب سامان لیس ہو گئے تو ایک نے بڑھ کر بادشاہ سلامت سے عرض کی کہ حکم ہو تو کڑھائی میں گل گلے پڑے۔ فرمایا نہیں اماں ابھی نہیں چھوڑو ان پر لوگ بیٹھ لیں اس وقت پکوان شروع ہو یہ کہہ نواب زینت محل اور نواب تاج محل کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ تاج محل تو ایسی خوبصورت نہ تھی ہاں زینت محل کی کچھ نہ پوچھو۔ عجیب قبول صورت پائی تھی شہر بھر میں ایک تھیں ان کی جامہ زیبی اور حسن کی تعریف ہی سن کر بادشاہ نے ان سے شادی کی تھی۔ رنگت ایسی سرخ و سفید تھی جیسے گلاب کی پتی یا شہاب اور میدہ۔ کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک ہاں بھویں بالکل نہ تھیں۔ اس کمی کو سرمہ کی بھویں بنا کر پورا کیا جاتا تھا۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ سر پر تاروں بھرا

ف نواب تاج محل کا قلعہ میں بڑا زور تھا گو ڈومنی مگر جب سے بادشاہ نے اس کو محل میں داخل کیا تھا۔ اس وقت سے بادشاہ اس کی مٹھی میں آگئے تھے بغیر اس کے حکم کے پتہ تک نہیں ہل سکتا تھا آخر نواب زینت محل نے اس کا کفر توڑا اور ایسی نکالی گئی کہ پھر قلعہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

گلنار دوپٹہ۔ جسم پر سرخ انگیا کرتی بادن کلی کا سبز زربفت کا پیجامہ۔ موتیوں جڑی گھیتلی جوتی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا سرمہ دانتوں میں مسی۔ ہونٹوں پر لاکھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ پرستان کی کوئی پری امریوں میں اتر آئی ہے۔ زینت محل نے تاج محل کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا۔ تاج محل نے زینت محل کو بُرے بُرے دیدوں سے گھورا۔ حکم سے لاچار تھیں۔ بادشاہ سلامت کے سامنے جو جھولا تھا۔ اس کے لال سبز ریشم کے رسّے اور گنگا جمنی پٹڑیاں تھیں۔ دونوں اٹھ اس میں جا بیٹھیں۔ زینت محل نے پاؤں جوڑے تاج محل نے جھونٹے لینے شروع کئے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا واہ جی واہ ایسا سُونا جھولنا ہم کو پسند نہیں۔ بی ڈمنھتی[۱] خانم اور دلدار[۲] کو بلاؤ۔ بھلا بیگمات جھولیں اور یہ دونوں حجرہ میں گھسی رہیں۔ یہ سنتے ہی دوار دابیگنیاں دونوں کو حجرہ میں سے پکڑ لائیں۔ دونوں بیچاریاں حجرہ میں نہا رہی تھیں۔ سارے کپڑے شور بور تھے پہلے تو سامنے آتے ذرا جھجکیں۔ مگر جب بادشاہ سلامت نے خود فرمایا "آؤ اماں قطب کی یہی بہار ہے" تو اس وقت ذرا ہمت بڑھی کپڑے

---

[۱] میں نہیں جانتا کہ اس لفظ کی املا کیا ہے۔ ڈمنھتی کے معنی "ٹیڑھے منہ والی" لقوہ سے اس کا منہ ذرا پھر گیا تھا۔ جو املا میری سمجھ میں آئی میں نے لکھ دی جو آپ کی سمجھ میں آئے آپ لکھ دیجیے۔ ڈمنھتی خانم غضب کی گانے والی تھی۔ تان رس خاں بھی اس سے ذرا کنیاتے تھے۔ آخر اسی سے ڈر کر نکل گئے بادشاہ کی غزلیں حضوری میں یہی گاتی تھی۔ دلدار اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں ڈیرہ دار رنڈیاں تھیں۔ بڑی بہن کی نواسی ددنی جان اور چھوٹی بہن کی نواسی کالی جان اب تک دلی میں موجود ہیں۔

بجتی ہوئی دونوں جھولے کے ادھر ادھر کھڑی ہوگئیں اور شہزادیاں بھی آواز ملانے آگئیں۔ ادھر انھوں نے ملہار شروع کیا اور ادھر کڑھائی میں گلگلہ پڑا۔ مٹھی خانم اور دلدار تو خیر رنڈیاں تھیں۔ تاج محل ڈومنی تھیں۔ مگر شہزادیوں کی آوازیں بھی رس میں ان سے کچھ کم نہ تھیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ سے شاید ہی کوئی محل والی ہوگی جو گانا نہ جانتی ہو۔ تان رس خاں اسی لئے نوکر تھے۔ تاج محل اسی لئے محل میں آئیں۔ بی مٹھی خانم اور دلدار کی اسی گانے سے بادشاہ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ اب جھولے کے ساتھ گانا شروع ہوا۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں جھولا کن ڈارو رے امریاں

رین اندھیری۔ تال کنارے۔ مرلا جھنگارے۔ بادل کارے

بوندیاں پڑیں بھیناں کھنیاں

جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

دو سکھی جھولیں۔ دو ہی جھلائیں۔ چار مل گیاں بھول کھلیاں

جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

وہ نور کے گلے۔ وہ رسیلی آوازیں۔ وہ اونچی تانیں۔ وہ وقت کی راگنی وہ سہانا وقت سبتے بتے اور ٹہنی ٹہنی سے جھولا کن ڈارو رے امریاں کی آواز آرہی ہے۔ مور درختوں سے اتر جوش میں آ سامنے ناچنے لگے۔ درختوں کے جانور چہکنے لگے۔ پپیہے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کو کو سے سارا جنگل گونج اٹھا غرض ایسا سماں بندھا کہ ایک دفعہ ہی فراٹے سے مینہ کا چھینٹا آیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ واہ اماں واہ قطب میں مینھ سے

بھاگتے ہو بھادوں کا چھینٹا ہے ابھی برسا ابھی نکل گیا۔ ہاں بی دلدار کوئی اور چیز ہو جائے اور ہاں تم سب ایک ہی جھولے کو کیوں گھیرے کھڑے ہو دوسرے جھولوں پر جاؤ۔ گاؤ بجاؤ کھاؤ پیو کچھ لطف اٹھاؤ۔

یہ سننا تھا کہ جھولوں کی طرف سب دوڑ پڑے۔ دو چار جھولوں پر تو بچوں نے قبضہ کر لیا جو باقی رہ گئے ان پر شہزادیاں ہو بیٹھیں۔ جب یہاں ذرا چھیڑ ہوئی تو دلدار نے دوسری چیز شروع کی۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
میں جوگن تیرے ساتھ
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا بجائے بین بانسری

جوگیا بجائے بین بانسری
جوگن گائے ہے ملہار
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی
جوگن نے چھایا ہے بدیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے

جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے
جوگن کے لمبے لمبے کیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

اب کیا پوچھتے ہو گرم گرم پکوان آرہے ہیں کھا رہے ہیں جھولا جھول رہے

رہیں ۔کوئی اندرسے کی گولی منہ میں دبائے ہے۔ کسی کے منہ میں سہال کا ٹکڑا ہے۔ کسی کے حلق میں بیسن کی پھلکی پھنس گئی ہے۔ سانس رک رہا ہے۔ مگر ٹہار ہے کہ چل رہا ہے۔ مینہ برس کر نکل گیا تھا۔ پھر بھی پانی کی بوندیں درختوں پر سے ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ ادھر بوند کڑھائی میں گری۔ تیل اڑا اور ادھر کسی نہ کسی کے منہ سے اوئی کی آواز نکلی۔ کسی کے ہاتھ پر چھینٹا پڑا تو کسی کے منہ پر کوئی اوئی توبہ ہے کہہ کر رہ گئی۔ کوئی کلا سہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی دوسروں نے پھر پکڑ کے یہ کہہ بٹھلایا۔ واہ بوا۔ تو رج کوئی نازک بن جائے۔ چھینٹا پڑتا ہی ہے۔ یوں کڑھائی چھوڑ کر کوئی نہیں اٹھ کھڑا ہوتا۔

بچّوں کے جھولوں پر کچھ اور ہی مزہ تھا۔ یوں ان کی سب سے زیادہ کھیت یہیں تھی دو جھولے تو لڑکوں کے قبضے میں تھے باقی لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ لڑکے تو جھولے میں کھڑے ہو وہ لمبے لمبے پینگ بڑھا رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہاں لڑکیاں جھولوں میں چھوٹی چھوٹی لال سبز پٹریاں ڈالے پاؤں جوڑے جھول رہی تھیں۔ وہ بے سُرا ملہار چل رہا تھا کہ واہ جی واہ۔ کسی کی تان کدھر جاتی تھی کسی کی کدھر۔ لڑائی بھی ہوتی جاتی تھی کہ لو بوا بس اترو بہت جھول چکیں اب ہماری باری ہے لیکن گانے کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا۔ گیت بھی بڑے مزے کا تھا ذرا سنیئے :-

اماں۔ اڑد جامن گھلے دھرے — اماں۔ میں نہیں کھاتی میری ماں
اماں۔ تتا پانی بھر ادھرا — اماں۔ میں نہیں نہاتی میری ماں
اماں۔ دھانی جوڑا سلا دھرا — اماں۔ میں نہیں پہنتی میری ماں

اماں۔ بھائی بھاوج من کھڑے   اماں۔ میں نہیں ملتی میری ماں

غرض پھوپھا پھوپھی سے لگا ماماؤں اور ناناؤں تک سب ملنے کو کھڑے ہیں مگر لڑکی کسی سے ملنے کا نام نہیں لیتی۔ آخر تلن اس پر ٹوٹی تھی کہ:۔

اماں۔ ساجن ڈولا لئے کھڑا   اماں میں نہیں جاتی میری ماں

یہاں تو یہ ہو رہا تھا اور وہاں جھرنہ پر کچھ اور ہی بہار تھی۔ بادشاہ سلامت جھرنہ سے نکل امریوں میں آتے ادھر شہزادیوں نے کواڑ بند کر ڈھیلے پائنچے اُتار تنگ پائجامے پہن دھم سے جھرنہ میں غوطہ مارا۔ کوئی ڈبکیاں لگا رہی ہے کوئی تیر رہی ہے کوئی کمر کمر پانی میں کھڑی چھینٹے لڑ رہی ہے۔ بچے الگ نہروں میں کھڑے اودھم مچا رہے ہیں۔ کچھ حوض کے سہ درے دالان میں کھڑی نہا رہی ہیں۔ کچھ پھسلواں پتھر سے پھسل رہی ہیں۔ بیچ گر کر قلابازیاں کھاتی ہیں۔ کیچڑ میں لت پت ہوتی ہیں حوض میں آکر کودتی ہیں۔ نہانے والیاں غل مچاتی ہیں کہ نکلو سارا پانی گدلا کر دیا۔ غرض ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں ایسا مست تھا کہ دنیا وما فیہا کی خبر نہ تھی۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ حضرت جہاں پناہ ناظر کے باغ تشریف لیجا رہے ہیں اب کیا تھا سب نے پانی میں سے نکل جھٹ پٹ کپڑے بدلے۔ بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نہروں میں سے نکالا۔ یہ ادھر ان کے کپڑے لینے گئیں اور ادھر وہ دھم سے پھر نہر میں کود گئے۔ بڑی مشکل سے بچوں کو پونچھ پانچھ کپڑے بدلوائے جھرنہ کے دروازے کھل گئے۔ سب کے سب وہاں سے نکل امریوں میں آئے تھوڑا بہت جھولا جھولا۔ پکوان کھایا اور ناظر کے باغ کا راستہ لیا۔

ناظر کا باغ جھرنہ سے قریب ہی ہے محمد شاہ بادشاہ کے ناظر روز افزوں

نے بنوایا تھا۔ امرلیوں کے سامنے ہی اس کا بڑا دروازہ ہے۔ دروازہ پر یہ تاریخ کندہ ہے:۔

پئے تاریخ سالش گفت ہاتف
غذا باشے بود باللہ مبارک

باغ کے گرد پختہ چاردیواری ہے۔ اندر چاروں طرف سنگ سرخ کی چار بارہ دریاں اور بیچ میں ایک عالی شان بڑی خوبصورت بارہ دری ہے۔ بیچ کی بارہ دری کے چاروں طرف چار حوض ہیں۔ ان حوضوں میں کئی کئی فوارے ہیں جھرنہ کا پانی اس باغ میں آتا ہے۔ ان چاروں حوضوں سے چار نہریں نکالی ہیں تھوڑی دور بہہ گئی اور دوسرے حوض میں گر گئی۔ اس سے نکلی تیسرے حوض میں جا گری۔ اسی طرح حوضوں میں سے یہ نہریں ہوتی ہوئی اور سامنے کی بارہ دریوں کے باہر گھوم کر باہر نکل جاتی ہیں۔ ان نہروں کی وجہ سے باغ کے چار حصے ہو گئے ہیں۔ نہروں کے دونوں کناروں پر چلنے پھرنے کیلئے پختہ روشیں ہیں۔ اس کے بعد گھاس کے تختے۔ ان درختوں سے ملی ہوئی پھولوں کی کیاریاں اور کیاریوں کے بعد گھنے سایہ دار درخت۔ شروع بھادوں تھا۔ آم کے پیڑوں پر بہار تھی۔ گوندنی کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بھلا بغیر اجازت کے کون ہاتھ لگا سکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ سلامت سے اجازت چاہی۔ اجازت ملی تھی کہ سب کے سب درختوں پر ٹوٹ پڑے۔ آدھے کھائے آدھے پھینکے۔ گٹھلیاں چلیں۔ چھلکے چلے تھوڑی دیر میں نئے کپڑے عجیب شان کے ہو گئے۔ بارہ دری کے حوضوں میں پھر سب جا کر نہائے کپڑے بدلے۔ خاصہ پر آ کر بیٹھے۔ مگر کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا بکواس اور آموں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ منہ جھوٹا کرنے کو بیٹھ گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں

دسترخوان بڑھ گیا۔ اس کے بعد سب میں اور وہی آموں کے درخت۔ شام تک کئی کئی جوڑے بدل گئے غرضکہ سارا کا سارا دن اسی جھرمٹ۔ امریوں اور باغ کے پھیر میں گذر گیا۔ شام کو جنگلی محل میں آکر دم لیتی تالی کہ صبح کی خبر لاتے۔

دوسرے دن قطب صاحب کی لاٹھ۔ علائی دروازہ[۱]۔ امام ضامن کے مقبرے۔ بیگم کی چھٹنکی[۲]۔ کڑوے میٹھے نیم[۳]۔ اور بارہ[۴] بادشاہوں کی قبروں کا چکر رہا۔ تیسرے روز جھیل تن جھیل من[۵][۶]۔ بکاولی کے قلعہ۔ جمالی کمالی کے مزار اور اندھیریا[۷]

---

۱ یہ دروازہ سلطان علاؤالدین کا بنوایا ہوا ہے۔ لاٹھ کے بالکل پاس ہی اور خوبصورتی میں لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

۲ مہرولی میں شمال کی طرف کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا پتھر پہاڑ کی چٹان پر رکھا ہوا ہے بچے بھی جاتے تو اس طرح ہلتا ہے کہ اب نیچے جا پڑیگا۔

۳ چھٹنکی کے قریب ہی ایک بزرگ کے مزار پر یہ درخت ہے۔ کہتے ہیں راجہ پتھورا کی بیٹی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی تھی، اس کی قبر پر نیم کا سایہ ہے۔ نیم کے درخت کا جو حصہ ان بزرگ کے مزار پر ہے اسکے پتے میٹھے اور جو حصہ راجہ کی لڑکی کی قبر پر ہے اس کے پتے کڑوے ہیں۔

۴ یہ پٹھان بادشاہوں کی قبریں ایک کھلے چبوترہ پر بنی ہوئی ہیں۔

۵ اولیا مسجد کے سامنے چالیس شہیدوں کے مزار ہیں کہتے ہیں کہ یہ کسی طرح گنتی میں نہیں آتے بے ترتیبی کی وجہ سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔

۶ جھیل تن جھیل من کے پاس ہی ایک عمارت ہے۔ سنتے ہیں کہ رات کے وقت اس میں سے گانیکی آوازیں آتی ہیں۔

۷ اندھیریا باغ قطب کی جان ہے۔ شمسی تالاب کے کنارے اس خوبصورتی سے لگایا ہے کہ دور سے گھرے ابر کا دھوکا ہوتا ہے۔ گھنا ایسا ہے کہ دن کی دھوپ بھی مشکل سے (بقیہ بر صفحہ ۴۸)

باغ کی سیر کی۔ غرض تین دن میں سارا قطب چھان مارا۔ تھک کر چور ہو گئے۔ پھرتے پھرتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ تب کہیں جا کر تھل سے بیٹھے۔ چودھویں تاریخ بھی آ گئی تھی صرف جنگلی محل، اور مرزا بابر کی کوٹھی قلعہ والوں کے پاس رہی باقی سارے قطب پر دلی والوں کا قبضہ ہو گیا۔

دلی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد اس میں ذرا تیزی آ جاتی ہے۔ ادھر تاریخ مقرر ہوئی اور ادھر کارخنداروں (کارخانہ داروں) کے ہاں بی پڑی۔ حسبِ مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا خرچ ہو گیا۔ اب رہے دوسرے خرچ وہ تم جاؤ اور تمہارا کام جانے۔ جی چاہے اٹھاؤ جی چاہے نہ اٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلی خالی ہونی شروع ہوئی۔ اجمیری دروازہ سے لگا قطب تک دوکانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جا رہی ہیں۔ رنڈیوں کی رتھیں نکل رہی ہیں۔ ایک رتھ ایسی کہ نظر لگے۔ فنس کی برجی اس پر زردوزی کے پھول اوپر سنہری کلس اطلس کے پھندنے کلابتوں کی ڈوریاں۔ سفید براق بہلے۔ اس پر رنگین بیل بوٹے۔ ناگوری بیل۔ ان پر زردوزی کام کی جھولیں گلے میں چاندی کے گھونگرو۔

(بقیہ صفحہ ۳۷) اس کے پتوں سے چھنتی ہے محمد شاہ بادشاہ نے اس باغ میں دنیا کے جو مزے اٹھائے ہیں وہ کسی بادشاہ کے خواب وخیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ اب اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ خیر۔ جو تھا سو تھا بھی گذار گئے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا شاہرخ کا مزار باغ کے بیچ میں ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے اب یہ باغ کسی قدر اجڑا ہو گیا ہے۔

سنبگوں رسنگوٹیاں۔ ریشم کی ناتھیں۔ اندر بناؤ سنگار کئے رنڈیاں بیٹھی ہیں ایک رتھ آئی نکل گئی۔ دوسری آئی نکل گئی۔ دلی کے شرفا گھوڑوں پر سوار۔ مخمل کی کار چوبی زین پوش لیسیں ٹکی ہوئی لگامیں۔ گنگا جمنی گہنا پہنے ہوئے گھوڑے۔ رنگی اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور تھامے سائیس۔ ان کے صاف وشفاف کپڑے۔ چھوٹی چھوٹی سرخ پگڑیاں۔ ایک ہاتھ میں باگ ڈور دوسرے میں چوہری۔ سوار ہیں کہ شہسواری کے انداز دکھاتے چلے جارہے ہیں غریبوں کا کچھ عجیب رنگ ہے۔ صرف ایک تہمت[1] بندھی ہے نہ جسم پر کرتہ ہے نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں سر پر ایک چھوٹا سا مٹکا اوندھائے ہوئے سرپٹ اُڑے جارہے ہیں۔ اب یہ نہ پوچھو کہ اس مٹکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اسی مٹکے میں ہے۔ تحفہ تحفہ کپڑے ہیں۔ لیس دار کار چوبی ٹوپی ہے لپواں سلیم شاہی جوتی ہے۔ روپئے ہیں پیسے ہیں بچھونا ہے۔ غرض سب ہی کچھ بھرا ہے۔ مٹکے میں اس لئے رکھا ہے کہ بھیگ نہ جائے۔ ترکیب اچھی نکالی ہے سامان کا سامان بچا اور مٹکا قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صبح سے جو یہ لین لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جاکر ختم ہوئی۔ ساری دلی خالی ہوگئی۔ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں کوئی مرد یا بچہ رہ گیا ہو۔

---

[1] لفظ تو "تہ بند" ہے اس سے تہمد ہوا پھر تہمت بن گیا۔ شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے ؎

آبرو کے قتل کو حاجت ہوئے کس کے گھر   خون کرنیکو چلے عاشق پہ تہمت باندھ کر

اب رہیں عورتیں تو انھوں نے دلی میں سیر منائی۔ سبزی منڈی نکل گئیں باغوں کی سیر کی۔ جھولے ڈالے کڑھائیاں چڑھائیں۔ آم کھائے۔ حوضوں میں نہائیں۔ غرض دل کے پورے ارمان نکال لیے۔ شاہی حکم تھا کہ سرکاری باغ میں دلی والیاں جائیں تو جانے دو۔ پردہ کرا دو۔ باہر پہرے لگا دو کہ کوئی مرد اندر نہ جا سکے۔ آگے یہ جانیں اور باغ جانے۔ انھوں نے بھی دو روز میں سارے باغوں کو لنڈورا کر دیا۔ آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کے ڈھیر لگا دیئے دن میں کئی کئی دفعہ اٹھائے جاتے اور پھر وہی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے۔

سیلانیوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لئے کونے تلاش کئے۔ کھلا قطب میں ٹھہرنے کیلیے جگہ کی کیا کمی تھی۔ سرکاری ڈیرے تھے شاہی مکانات تھے۔ پرانے کھنڈر تھے۔ امرا تو اپنے مکانوں میں جا ٹھہرے۔ روپیہ پیسے والوں نے سڑک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے کرایہ پر لے لئے غربا کچھ تو ڈیروں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے۔ کچھ جھرنہ میں جا ٹھہرے۔ کچھ ناظر کے باغ میں اتر گئے لیکن جن کو قطب کا لطف اٹھانا تھا انھوں نے آسمان کے نیچے ڈیرا کیا۔ مینھ برستا ہے برسنے دو۔ یہی قطب کی بہار ہے۔

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو اس سرے سے اس سرے تک سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دکانیں لگ گئیں۔ میوے مٹھائیاں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں۔ کچوریاں بیوڑیاں اندر سے اور سہال تلے جا رہے تھے تو دوسری طرف کبابوں پراٹھوں بریانی۔ مزعفر اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار مہک رہا تھا۔ گاہک ہیں کہ

ڈوبے پڑتے ہیں۔ لیا۔ کھایا۔ چبتے وہیں پھینک آگے بڑھے پنواڑن کی دکان پر پہنچے۔ بی پنواڑن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے۔ کنگھی کیے۔ آنکھوں میں سرمہ لگائے دانتوں میں مسّی ملے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھی پان بنا رہی ہیں۔ دیسی پان لال لال صافیوں میں لپٹے سامنے دھرے ہیں۔ پان بن رہے ہیں۔ مذاق ہو رہا ہے۔ یار لوگوں نے پان لیے۔ خود کھائے۔ دوسروں کو کھلائے۔ پیک تھوکی۔ آگے بڑھے۔ پھول والوں کی دکانوں سے گجرے لیے۔ گلے میں ڈالے۔ ساقی کے پاس ٹھہر دو دم حقے کے مارے ایک دو پیسے دیے آگے قدم بڑھایا۔ ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے۔ حقہ کیا ہے تماشا ہے کوئی گز بھر اونچا نیچہ اس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ پاؤ تمباکو آئے۔ نے ایسی ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ نے کو سنبھالنے کے لیے کئی کئی گھوڑیاں دبے رکھی ہیں۔ نے پر رغن چڑھا ہے۔ اوپر موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں۔ خود بھی سفید کپڑے پہنے سبز بنارسی سیلا باندھے۔ لال ٹیکا لپیٹے کھڑے حقہ پلا رہے ہیں کوٹھے والوں کو پلانا ہوا تو نے سیدھی کر دی۔ انھوں نے بھی دو کش کھینچ لیے ادھر کسی نے چھنال پر ہونٹ رکھے اور انھوں نے شعر پڑھنے شروع کیے ؎

حقہ جو ہے حضور معلّیٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھرا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ کٹھالی پھینکو

تو سرد ہو جاتے۔ مغرب کے بعد ہی جھرنہ سے نفیری کی آواز آئی۔ لیجئے پنکھا
اٹھا۔ اب ہر شخص ہے کہ جھرنہ کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں کچھ واپس
آرہے ہیں ریلہ پر ریلہ پڑ رہا ہے۔ جو ذرا دم خم والے ہیں وہ ان جھونکوں
کو سینہ اور پشت پر سہ رہے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہیں وہ یہ کہہ کر
ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ ارے بھئی جانے بھی دو کون اس
بلا میں پڑے آگے چل کر پنکھا دیکھ لیں گے۔

پنکھا جھرنہ سے اٹھا شمسی تالاب سے ہوتا ہوا مہرولی کی سڑک پر
آیا یہاں پہلے ہی سے مشعلیں، لالٹینیں، گلاس، ہانڈیاں، فانوس اور
دیوارگیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی ایسی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے
کا جلوس بازار میں سے گزرنا شروع ہوا۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے
روپہلی ٹھپہ ٹکے ہوئے سبز کرتے لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں، کسی کے
گلے میں ڈھول۔ کسی کے گلے میں تاشہ۔ ہاتھوں میں چوبیں۔ دھوں دھوں
کرتا اس طرح گذرا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ ان کے پیچھے دو جھنڈے
زرلفت کے پھریرے۔ مقیش کے پھندنے، کلابتون کی ڈوریاں۔ جھنڈوں
کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لالٹین۔ ایک لالٹین
کے سرے پر سنہرا ہلال دوسرے پر روپہلی چکر ان کے بعد شرف الحق
کوتوال کا گھوڑا۔ اردلی میں پولیس والوں کا پرا۔ ان کے پیچھے نوبت خانہ
کا تخت۔ تخت کیا ہے پوری بارہ دری ہے۔ تختوں کے اوپر بانسوں
کی بارہ دری کھڑی کر۔ اوپر کھپچیوں کا نصف گنبد بنا کپڑا منڈھ

بنی لگا۔ کاغذوں کے پھولوں سے سجا۔ دروں میں گیندئی پردے ڈال۔ ڈوریوں سے کس دیئے نوبت والے اندر جا بیٹھے۔ تخت کو کہاروں نے اُٹھایا اور یہ خاصہ مکان کا مکان جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانہ کے پیچھے دل کے اکھاڑے۔ ہر اکھاڑے کے ساتھ ایک استاد۔ بیس بیس پچیس پچیس شاگرد۔ بنے ہوتے تیار جسم۔ چوڑے چوڑے سینے۔ بھرے بھرے ڈنڈ۔ بھری ہوئی مچھلیاں۔ پتلی پتلی کمریں۔ جسم پر چست جانگیے۔ گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ کوئی بنیٹھی کا چکر باندھ رہا ہے۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے۔ کہیں پھری گتکہ سے مقابلہ ہو رہا ہے کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھلائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے ان کے پیچھے نفیری والے اور ان کے ساتھ دلّی کے سقے۔ سفید براق کپڑے پہنے لال کھاروے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے سبز سیلے سروں پر باندھے۔ ہاتھوں میں مانجھے منجھائے پیتل کے کٹورے لئے نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملاتے چلے آ رہے تھے۔ نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں۔ ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے۔ پندرہ بیس کا حلقہ۔ بیچ میں طبلہ سارنگی والے تال سُر پر ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ عجیب مزا دے رہی تھی ان کے پیچھے تختِ رواں۔ تختوں پر رنڈیاں بھاری بھاری پشوازیں پہنے۔ کارچوبی دوپٹے اوڑھے پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ ان کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا رسالہ۔ سرخ بانات کی وردیاں ان میں سفید بانات

کے کف اور کالر۔ شانوں پر فولادی جال۔ بازوؤں میں کالی برجسین۔ لک کے چمڑے کے اونچے بوٹ۔ سر پر سرخ منڈاسے ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے لئے گھوڑوں کی کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی اور سیلانیوں کا اژدہام۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے کارچوبی ٹوپیاں۔ مداخل ٹکے ہوئے۔ نیچی چولی کے انگرکھے۔ ایک برے پیجامے۔ سلیم شاہی جوتیاں۔ ان کے بعد پھیر ا پلٹن کی چار قطاریں۔ کم عمر گورے گورے لڑکے۔ سر پر دھانی منڈاسے۔ منڈاسوں پر چھوٹی چھوٹی کلغیاں۔ سبز اطلس[۲] کے کوٹ۔ سفید اطلس کی کسی ہوئی برجسیں سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے۔ ہاتھوں میں سبز پھریروں کے چھوٹے چھوٹے نیزے بڑی آن بان سے قدم ملائے چل رہے ہیں۔ ان کے پیچھے دلی کے شرفا اور عمائد کا ہجوم۔ نیچی نیچی قبائیں اور چغے۔ ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی گیندی پگڑیاں۔ مسلمانوں کے سروں پر زعفرانی عمامے اور

---

[۱] شرفاءِ دہلی کے لڑکوں، کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی۔ بچے تو لڑکے مگر غدر میں بادشاہ کے نیچے سب کٹ کر ڈھیر ہو گئے ان کے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے۔ تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ خدا معلوم کیا بات ہے۔ ہاری ہوئی فوج تھی شاید اس لئے ان کا ذکر غیر درست سمجھا گیا۔

[۲] دہلی کا شاہی رنگ سبز تھا۔

چوگوشہ ٹوپیاں۔ ہاتھوں میں رنگ برنگ کی چھڑیاں۔ ہشاش بشاش چہرے گلے میں پھولوں کے گلچھے۔ ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں۔ موسم کا لطف اٹھاتے میلہ کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ ان کے بعد شاہی شہنائی نوازوں کا گروہ نفیری کے کمال دکھاتا۔ موسم کی چیزیں بجاتا خود بھی اپنے کمال کے مزے اٹھاتا پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے۔ سب سے آخر میں پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والوں کا غول۔

بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا۔ بنی چڑھا آ بیٹھنے لگا۔ پھولوں سے سجا ایک رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش محبت اور یگانگت کا نشان تھا۔ جس نے چھوٹے بڑے مسلمانوں غربا، امرا غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقے کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال مہرولی میں لے آیا تھا یہ پنکھا نہ تھا بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا۔ اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا اس میں خود بادشاہ شمع اور رعایا ان کے پروانے۔

غرض خلقت کا یہ ہجوم پھوار میں بھیگتا۔ خس کے پنکھے چلتا آہستہ آہستہ مہرولی کی سڑک پر سے گذرا۔ باجے والے اور نفیری والے ہر کمرہ کے سامنے ٹھہرتے ایک آدھ چیز سناتے انعام لیتے۔ آگے بڑھتے۔ ہوتے ہوتے یہ جلوس شاہی دروازہ کے سامنے پہنچا۔ بادشاہ سلامت اوپر کی بارہ دری میں برآمد ہوتے بیگمات کے لئے چلمنیں پڑ گئیں۔ اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آگئی۔ پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا یہاں باجے والوں نے

اپنے کمال دکھاتے۔ اکھاڑے والوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ سقوں نے کٹورے بجائے۔ ڈنڈے والوں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ رنڈیوں نے اپنا ناچ دکھایا۔ سب کو حسب مراتب انعام ملا۔ کسی کو سید ملا کسی کو دوشالہ ملا کسی کو مندیل ملی کسی کو کڑے ملے۔ اتنے میں پنکھا بھی سامنے آگیا۔ شہر کے شرفاء اور امراء مجرا بجالاتے۔ اوپر سے سارے مجمع پر گلاب پاشوں سے گلاب اور کیوڑہ چھڑکا گیا۔ عطر اور پان سے تواضع کی گئی۔ بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولی عہد بہادر نیچے اُتر گئے۔ لوگوں کے گلوں میں کنٹھے ڈال کر سب کو رخصت کیا۔ یہاں سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہوگئے کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ پنکھا جوگ ملیا جی پہنچ گیا۔

یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر ہے۔ بڑی لمبی چار دیواری ہے۔ کونوں پر برجیاں ہیں۔ احاطہ کے اندر ۲۰ - ۲۲ عمارتیں اور بیچ میں دیوی کا استھان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوی کشن جی کی بہن تھیں بجلی بن کر الوپ ہوگئیں۔ اور یہاں آن پڑیں۔ راجہ یدھشٹر نے مندر بنوایا مندر زمین کے برابر ہوگیا تھا۔ پھول والوں کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایما سے لالہ سیدھومل نے نیا مندر بنوایا رفتہ رفتہ اور عمارتیں بھی اندر بن گئیں اب یہ خاصی آباد جگہ ہوگئی ہے۔ اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر پلنگ یا چارپائی نہیں جاسکتی۔

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوتے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اُٹھا۔ باب ظفر کے سامنے آکر ٹھیرا بعض

مصاحبوں نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف میں کسی نہ کسی طرح لے چلیں۔ مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوتے تھے۔ اہل یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب میں جوگ مایا جی کے پنکھے کے ساتھ نہیں گیا تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں۔ ہمارے ہندو بھائی کیا خیال کریں گے کہیں گے کہ مسلمان تھا مسلمانوں کے پنکھے میں شریک ہو گیا۔ ہم کو غیر سمجھا اس لئے جھروکوں سے نیچے بھی نہیں آئے۔ ناواں نا جیسا ایک کے ساتھ کرنا ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے اب بھی جائیں گے۔ آتشبازی میں

لہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ بادشاہ کو آتشبازی کا بڑا شوق تھا۔ آتشباز نوکر تھے کوئی میلہ نہ تھا جس میں قلعہ سے آتشبازی نہ جاتی ہو۔ دہلی والوں سے مقابلے ہوتے تھے۔ ان مقابلوں کے دو بڑے میدان تھے ایک شمسی تالاب دوسرے سید حسن رسولنما کا حوض۔ پھول والوں کی سیر میں تو اب آتشبازی نہیں چھٹتی ہاں سید حسن رسولنما میں اب بھی خوب مقابلے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے بیان کی تائید اب ایک کتاب سے بھی ہو گئی۔ ابھی حال میں مسٹر اینڈ روز نے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ خاں دہلوی کی سوانحعمری لکھی ہے اور دہلی کے بڈھوں بڈھوں سے پوچھ پوچھ کر غدر سے پہلے کے حالات جمع کئے ہیں اس میں بادشاہ کے اس شوق کا بھی ذکر ہے اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور دہلی والوں میں کیا تعلقات تھے اور کس طرح ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے جس بڈھے سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ ہندو ہو یا مسلمان اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا قصہ بیان کر رہا ہے بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی ۱۹۲۹ء میں ڈیٹیو میفر اینڈ سنز لمیٹڈ کیمبرج نے چھاپی ہے اور قیمت ہیر ہے۔

ہندو مسلمان سب ہی شریک ہوتے ہیں وہاں ہم بھی چلیں گے۔"
خیر درگاہ شریف[1] تو قریب ہی تھی لوگ دس بجے پنکھا چڑھا کر فارغ ہوگئے اور یہاں سے نکل سیدھے شمسی تالاب پہنچے تھوڑی دیر میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ بیگمات کے لئے جہاز پر چلمنیں پڑگئیں۔ وہ اندر جا بیٹھیں بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جلوس کیا۔ مصاحبوں اور دلی کے اکثر امرا کو اوپر بلا لیا گیا۔ سارے سیلانی تالاب کے کنارے جم گئے۔ تالاب میں سیکڑوں کشتیاں بجرے اور نواڑے پہلے ہی سے پڑ گئے تھے۔ آدھوں میں ستا ہی

---

[1] یہ درگاہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی ہے آپ حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ سلطان شمس الدین التمش کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ کا وصال قوالی میں اس شعر پر ہوا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانی دیگر است

دہلی کے بادشاہوں نے آپ کے مزار کے گرد سنگِ مرمر کی جالیاں، فرش اور دروازے بنوائے دیواروں پر کاشانی اینٹوں کا کام کرایا اور آس پاس کی مسجدیں اور مجلس تعمیر کرائے خود مزار شریف تو کچی مٹی کا ہے ہاں آس پاس دوسروں کی قبروں کے بڑے عمدہ عمدہ سنگِ مرمر کے تعویذ ہیں ایک طرف سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد ہے۔ اور اس کے پہلو میں آخری بادشاہان دہلی کی مزار بیچ میں شاہ عالم ثانی کا مزار ہے اور اس کے ایک طرف اکبر شاہ ثانی کی قبر۔ ایک پہلو خالی تھا۔ اس میں بادشاہ نے اپنا سردار بنوایا تھا۔ خیال تھا کہ مرنے کے بعد باپ دادا کے پہلو میں جا پڑیں گے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ وہاں قبر بنے گی جہاں باپ دادا کا پہلو تو کجا کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔

آتشباز سوار ہو کر ایک طرف چلے گئے۔ باقی میں دہلی کے آتشباز اور شوقین بیٹھ کر دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا کہ دونوں پارٹیاں مقابلہ کو تیار ہو گئیں

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھٹی۔ مہتابی کا چھٹنا تھا کہ میدانِ کارزار گرم ہو گیا۔ سب سے پہلے غبارے چھوڑے گئے۔ اور ذرا سی دیر میں آسمان پر ہزاروں چاند اور سورج نکل آئے۔ ان سے فراغت ہوئی تو جنگی آتشبازی[1] کا نمبر آیا۔ ہوائیاں[2] چھکے[3] لٹو اور خننگے[4] چلے۔ ہوائیوں کی شائیں شائیں چھکوں کی غائیں غائیں۔ لٹوؤں کی دھائیں دھائیں۔ خننگوں کی زائیں زائیں اور قلموں کی سائیں سائیں سے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہو رہی ہے ادھر آسمان پر مقابلہ ہو رہا تھا ادھر پانی پر آتشبازی کے بجرے چھوٹے۔ بجرے کیا تھے چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ توپوں کی جگہ مہتابیاں اور چھچھوندریں، گولوں کی جگہ

---

[1] دہلی والوں نے آتشبازی کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک جنگی دوسرے گلکاری ان دونوں کا مطلب آگے آپ خود سمجھ جائیں گے۔ [2] بڑے اڑن انار کو دہلی میں ہوائی کہتے ہیں [3] موٹے مضبوط بانسوں کی لمبی لمبی پوریوں پر آنتیں لپیٹ اوپر سے جھلی چڑھا اور اندر خوب بارود ٹھونس ٹھونس کر چھکا بنایا جاتا ہے اس کا چلانا واقعی بڑا کمال ہے۔ بارود کو آگ دیکر اس کو ہلانا شروع کیا جب زور پکڑ گیا تو جھلا کر اور کئی چکر دیکر اوپر چھوڑ دیا۔ اب بانس کی یہ آدھ گز لمبی پوری غائیں غائیں کرتی اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ اگر چھوڑنے میں کہیں ہاتھ بچارہ گیا اور یہ پوری تماشائیوں میں گھس گئی تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا منہ جھلس گیا کسی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ غرض یہ آتشبازی کیا ہے ایک بلا ہے [4] مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے گولے بناتے ہیں یہ اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک طرف چھید کیا اور بارود بھر دی۔ چھید میں چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی چلاتے وقت چھچھوندر کو آگ لگا لٹو کو اوپر پھینکا بارود نے آگ لی اور لٹو پھٹا۔ اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے

چکر اور خفنگے مستولوں کی جگہ انار، مونوں کی جگہ مٹی کے سپاہی، پیٹ میں بارود ناف میں چھچھوندر[1]، اس سرے سے اس سرے تک تشابہ کا سلسلہ، ادھر سے دلّی والوں کے تجربے چلے ادھر سے قلعہ والوں کے تجربے آتے۔ بیچ تالاب میں پہنچ کر دھواں دھوں ہونے لگی۔ سمندر کی لڑائی کا مزا آگیا۔ آتشبازی کی چمک سے سارا تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے اور پانی میں روشنی کے عکس، کشتیوں کی سائے، آتشبازوں کے ننگے ننگے جسم، کناروں پر خلقت کے ہجوم، ان کے غل آتشبازی کے عکس سے ان کے زرد زرد چہروں اور اوپر دھوئیں کے بادلوں نے ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی مہتابیوں، آفتابیوں، اناروں، سہر دلی، جائی جوئیوں، ہتھ پھولوں اور چرخیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونوں طرف کی کشتیاں سمٹ کر بالکل جہاز کے سامنے آگئیں۔ یہاں اُستادوں نے اپنے ہنر کے کمال دکھاتے۔ سنہری چھوڑی تو ایسی کہ ٹوٹ کر سو سو دفعہ اُٹھے اور رہ رہ کر سانس لے۔ تماشہ انار ایسے کہ کئی کئی سو گز اونچے جائیں۔ اور بیچ رنگی پھول دیں۔ اور پھر یہ مزا کہ ہتھیلی پر چھوڑ لو کیا مجال جو جرکہ لگے۔ بڑے انار جو اٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سرو کے درختوں کو آگ لگا کر کشتیوں میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان میں سے رنگ برنگی پھول جھڑ رہے ہیں۔ دم اتنا کہ ختم ہونا ہی نہ جانیں۔ کمال یہ کہ کپڑے پر دھبہ نہ دیں۔ آتشبازی کی روشنی سے تو یہ نظر آتا تھا کہ تالاب کا سارا پانی سونے کا ہو گیا ہے۔ اور اس کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تالاب میں آتشیں باغ لگا دیا ہے۔

[1] بڑی چھچھوندر کو قلم کہتے ہیں۔ اس کی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر لٹنا جانتی ہی نہیں پانی کی چوٹ کھا کر اٹھتی ہے تو پچیس تیس گز اونچی اڑ جاتی ہے۔

غرض دو بجے کے قریب آتشبازی ختم ہوئی۔ بادشاہ کی طرف سے شال دوشالے مٹھائیاں اور پیسے تقسیم ہوئے کہیں تین بجے جا کر لوگوں کو فرصت ہوئی سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا پڑے۔ بادشاہ سلامت کی سواری رات ہی کو قطب سے نکل گئی۔ اور روشن چراغ دہلی ہوتی ہوئی تیسرے پہر تک دہلی آگئی دوسرے روز لوگوں نے صبح ہی صبح اٹھ میوے مٹھائیاں پراٹھے چھلے اور کھلونے خریدے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نکل اپنے گھروں کا راستہ لیا۔ شام تک مہرولی سنسان اور دہلی آباد ہو گئی۔

دیکھ لیا آپ نے پھول والوں کی سیر کا مزا۔ اور اب کی کیا پوچھتے ہو۔ غدر ہوا دہلی تباہ ہوئی۔ بادشاہ رنگون پہنچے۔ بندھن ٹوٹ گیا۔ تیلیاں بکھر گئیں۔ بندھن اب بھی ہے مگر وہ محبت کا بندھن تھا اور یہ قانون کا بندھن ہے۔ ذرا کچھ بات ہوئی اور چل پھبا عدالت میں۔ بات یہ ہے کہ پھول والوں کی سیر رعایا کی عقیدت اور بادشاہ کی محبت کا مظاہرہ تھی۔ بادشاہ کے بعد بھی چلی مگر مرکز اور یک جہتی نہ ہونے سے زور گھٹتا گیا۔ اب پانچ چھ برس سے بالکل بند ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہیں اور دلوں کی کدورت کا یہی حال رہا تو ہمیشہ کیلئے اس کو بند ہی سمجھو۔

اب ہنستیں ہیں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

مضمون ختم ہو گیا۔ پڑھنے کے بعد ہر شخص کے دل میں یہ خیال ہو گا کہ یہ واقعات ہیں یا کوئی من گھڑت قصہ اس کے متعلق میں بعض باتوں کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس مضمون میں جس قدر تاریخی واقعات یا مکانات کے نقشے ہیں آپکے

ؔ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا مزار پرانی دہلی میں ہے۔ قطب سے ۵ میل اور دہلی سے کوئی میل آپ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ ہیں اور دہیں سے آپ کو چراغ دہلی کا خطاب ملا تھا جہاں آپ کا مزار ہے اس بستی کو اسی خطاب کی وجہ سے چراغ دہلی یا روشن چراغ دہلی کہنے لگے۔

صحت میں تو کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ بقیہ واقعات کے متعلق دل میں ڈگدا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی یہ کیفیت ہے کہ جھرنے اور امریوں کے واقعات کا حال میں نے اُن بڈھوں سے سنا ہے جو ان جلسوں میں شریک تھیں۔ اس زمانہ کی سیر کرنے والے اب بھی دہلی میں موجود ہیں وہ میرے ایک ایک حرف کی تائید کریں گے۔ جلوس کی تصویر خود میں نے اپنے مصوری کے اُستاد کے ہاں دیکھی ہے۔ میں نے صرف یہ کیا ہے کہ ان واقعات کو ذرا کر رنگ بھر دیا ہے۔ اب رہی گفتگو تو وہ البتہ میرے خیالات کا نتیجہ ہے لیکن جو تعلقات اور محبت رعایا اور بادشاہ میں تھی اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس گفتگو کو بھی مبالغہ آمیز نہیں کہا جا سکتا۔ مسٹر سی ایف اینڈریوز کی کتاب "ذکاء اللہ دہلوی" اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو جائیگا کہ جو کچھ میں نے اس بارے میں کہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ مسٹر اینڈریوز میرے اُستاد تھے مجھے معلوم ہے کہ کس طرح بڈھے بڈھوں سے مل کر انھوں نے غدر سے پہلے کے حالات دریافت کئے ہیں اور خود ان پر اس تحقیقات کا کیا اثر ہوا ہے۔ اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سنہ ۱۲۶۲ھ کا انتخاب کیوں کیا گیا اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ سنہ ۱۲۶۲ھ تک بہادر شاہ کی زندگی بہت چین چان اور امن و امان سے گذری۔ اس کے سال بھر بعد ہی سے اس بیچارے پر پے در پے مصیبتیں آنی شروع ہوئیں۔ دارا بخت ولیعہد کا انتقال ہوا۔ مرزا فخرو جیسے بچے مرزا شاہرخ مرے۔ خود بادشاہ کو زہر دیا گیا۔ جواں بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے قصہ مختصر یہ کہ غدر تک ان مصیبتوں نے بیچارے بڈھے بادشاہ کو لٹھا دیا۔ اسی خیال سے میں نے وہ آخری سال لیا ہے جب بادشاہ ان تمام فکروں اور مصیبتوں سے آزاد تھے۔

بہر حال یہ بڈھوں کی ودیعت تھی جو میں نے آپ تک پہنچا دی۔ اب چاہیں آپ اس کو قبول کریں یا نہ کریں +